گوشۂ تنہائی

(شعری مجموعہ)

محمد تقی عثمانی

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)

شعر انسانی جذبات کے اظہار کا موثر ترین ذریعہ ہے، اور انسانی جذبات میں بھی جذبۂ محبت کے اظہار کے لئے شعر کی زبان سب سے زیادہ موزوں ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہو کہ شعر کا اصل موضوع ہی محبت ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ حسن و عشق کی وہ لطیف کیفیات جو دل کے نہاں خانوں میں پرورش پاتی ہیں، ان کا تعلق احساس و ادراک سے ہوتا ہے، اور اکثر اوقات الفاظ کا لباس ان پر پوری طرح فٹ نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات الفاظ کا بوجھ ان کی نزاکت کو کچل کر رکھ دیتا ہے، اسی لئے کہنے والے نے کہا تھا کہ ؎

آہے کہ ز دل خیزد، از بہر جگر سوزی ست
در سینہ شکن اورا، آلودہ مکن لب ہا

اور ؎

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

لیکن ان بے نام کیفیات کی بھی اگر کسی درجے میں کوئی تعبیر ممکن ہے تو اس کا لطیف ترین ذریعہ شعر ہی ہے، اور اس لئے شعر اور محبت کا ہمیشہ چولی اور دامن کا ساتھ رہا ہے۔

(جاری ہے...)

درد سے، یادوں سے، اشکوں سے شناسائی ہے

کِتنا آباد مِرا گوشۂ تنہائی ہے

اُن کے نام

فہرست

حرفِ آغاز

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی
رسولہ الکریم وعلی آلہ وصحبہ اجمعین.

میں کوئی باقاعدہ شاعر نہیں ہوں ، لیکن علمی اور نسبی طور پر ایسے خانوادوں سے وابستہ ہوں جو باقاعدہ شاعر نہ ہونے کے باوجود امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح شعر کہتے رہے ہیں۔ علمی طور پر اکابر علمائے دیوبند میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے لیکر حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تک مجھے کوئی نام یاد نہیں آرہا جس نے کبھی نہ کبھی عربی، فارسی یا اردو میں شعر نہ کہے ہوں۔ اور نسبی طور پر شعر وادب کا ذوق میں نے

اپنے والدِ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ورثے میں پایا جو شاعر کی حیثیت سے معروف نہ ہونے کے باوجود عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ایسے اشعار کہتے رہے جنہیں سُن کر جناب جگر مراد آبادی جیسے شاعر بھی میرے سامنے جھومتے تھے۔ میرے بھائیوں میں جناب زکی کیفی رحمۃ اللہ علیہ تو ایسے صاحبِ طرز شاعر تھے کہ "کیفیات" کے نام سے اُن کا مجموعۂ کلام وقت کے بڑے بڑے شعراء سے خراجِ تحسین وصول کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ میری بڑی بہنیں بھی کسی کالج یا یونیورسٹی سے پڑھے بغیر ایسے اشعار کہتی رہیں جو آج کے گریجویٹس کی سمجھ میں آجائیں تو غنیمت ہے۔

اتفاق سے جب میں نے عربی پڑھنی شروع کی تو ہمیں حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسے استاذ ملے جو غزل کے بہترین شاعر تھے، اور ہمیں درس کے دوران شاعری کے رموز سمجھایا کرتے تھے۔

اس سارے ماحول کا نتیجہ یہ تھا کہ گویا شعر گھٹی میں پڑ گیا، اور اچھے شعراء کا کلام سُننے اور پڑھنے کا شوق بچپن کے اُس دور سے شروع ہو گیا جب شعر کی معنوی گہرائی تک پہنچنے کی قابلیت بھی نہ تھی، لیکن طبیعت شعری وزن کے زیر و بم اور قافیہ وردیف کے دروبست ہی سے لطف لینے لگی تھی۔

اسی شوق نے رفتہ رفتہ کچھ تُک بندی پر آمادہ کر دیا، اور رفتہ رفتہ یہ تُک بندی کبھی کسی نظم اور کبھی کسی غزل کی شکل میں بدل گئی اور اپنے خشک مشاغل

کے دوران ایسے لمحات بھی آجاتے جب طبیعت بے ساختہ نثر سے نظم کی طرف محوِ پرواز ہو جاتی، کبھی کوئی اچھی غزل سُن لیتا تو اُسی زمین میں خود بخود کچھ اشعار وارد ہو جاتے تھے۔

لیکن یہ سب کچھ خود کلامی ہی تھی، نہ کبھی اپنے اشعار شائع کرنے کا خیال آیا، نہ مشاعروں میں سُنانے کا، کبھی کبھی گھریلو محفلوں میں نظمیں سُنانے کا اتفاق ضرور ہوا، لیکن شاید بیشتر اشعار ایسے ہیں جو کہیں سنانے کی بھی نوبت نہیں آئی، اور ان کے بارے میں بقولِ اقبال مرحوم میرا مسلک یہ رہا کہ ؎

آہے کہ زدل خیز از بہرِ جگر سوزی ست
در سینہ شکن اورا، آلودہ مکن لب ہا

لیکن اب کچھ عرصے سے، جب سے جنید جمشید مرحوم نے میری تنہائی کے بعض واردات کو اپنے ترنّم سے سجا کر عالمگیر بنا دیا، اس وقت سے دوستوں نے اصرار شروع کر دیا کہ میں اپنی خود کلامی کو منظرِ عام پر لاؤں۔ اور یہ فرمائشیں اتنی بڑھ گئیں کہ مجھے اپنا یہ مسلک چھوڑنا پڑا اور اب اُس مسلک سے رجوع کا عملی مظاہرہ یہ چھوٹی سی کتاب ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ خدا کرے کہ یہ آپ کے شعری ذوق کی کچھ تسکین کر سکے۔

شعر گوئی کے لئے نے میں اپنا تخلص آسیؔ رکھا تھا۔ اور بکثرت نظموں اور

غزلوں میں وہی استعمال ہوا ہے۔ لیکن کہیں کہیں تقی بھی تخلّص کے طور پر آ گیا ہے۔

میرے بھتیجے اور حضرت زکی کیفیؒ کے فرزند سعود عثمانی سلمہٗ اس وقت ماشاء اللہ شاعری کے عروج پر ہیں، اور اُن کا اچھوتا طرزِ بیان نثر اور نظم دونوں میں اپنا لوہا منوا رہا ہے، میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے غیر مرتب اور منتشر اشعار کو ان کی نظرِ ثانی کے بغیر شائع نہ کروں، چنانچہ انہوں نے نہ صرف نظرِ ثانی کی، بلکہ اس کتاب کو مرتب کرنے کا سہرا انہی کے سر ہے، اُن کے مشوروں سے بھی میں نے فائدے اٹھائے، اللہ تعالیٰ انہیں دونوں جہانوں میں ترقیّات عطا فرمائیں۔ آمین۔

بندہ

محمد تقی عثمانی

۲۴/ ربیع الثانی/ ۱۴۴۱ھ

۲۲/ دسمبر/ ۲۰۱۹ء

مُلتزم پر

الٰہی تیری چوکھٹ پر بھکاری بن کے آیا ہوں
سراپا فقر ہوں، عجز و ندامت ساتھ لایا ہوں

بھکاری وہ کہ جس کے پاس جھولی ہے، نہ پیالا ہے
بھکاری وہ جسے حرص و ہوس نے مار ڈالا ہے

متاعِ دین ودانش نفس کے ہاتھوں سے لٹوا کر
سکونِ قلب کی دولت ہوس کی بھینٹ چڑھوا کر

گنوا کر عمر ساری غفلت وعصیاں کی دلدل میں
سہارا لینے آیا ہوں ترے کعبے کے آنچل میں

گناہوں کی لپٹ سے کائناتِ قلب افسردہ
ارادے مضمحل، ہمّت شکستہ، حوصلے مُردہ

کہاں سے لاؤں طاقت دل کی سچّی ترجمانی کی
کہ کس جنجال میں گذری ہیں گھڑیاں زندگانی کی

خلاصہ یہ کہ بس جل بھُن کے اپنی رُوسیاہی سے
سراپا شرم بن کر اپنی حالت کی تباہی سے

ترے دربار میں لایا ہوں اب اپنی زبوں حالی
تری چوکھٹ کے لائق ہر عمل سے ہاتھ ہیں خالی

تری چوکھٹ کے جو آداب ہیں، میں ان سے خالی ہوں
نہیں جس کو سلیقہ مانگنے کا، وہ سوالی ہوں

یہ آنکھیں خشک ہیں یا رب! انہیں رونا نہیں آتا
سلگتے داغ ہیں دل میں جنہیں دھونا نہیں آتا

یہ تیرا گھر ہے، تیرے مہر کا دربار ہے مولا
سراپا قُدس ہے، اِک مہبطِ انوار ہے مولا!

زباں غرقِ ندامت دل کی ناقص ترجمانی پر
خدایا! رحم میری اس زبانِ بے زبانی پر

مُناجات

مجھے زندگی میں یارب! سرِ بندگی عطا کر
مرے دل کی بے حسی کو غمِ عاشقی عطا کر

ترے درد کی چمک ہو، تری یاد کی کسک ہو
مرے دل کی دھڑکنوں کو نئی بے کلی عطا کر

جو تجھی سے لَو لگا دے، جو مجھے مرا پتا دے
مرے عہد کی زباں میں، مجھے گمرہی عطا کر

میں سفر میں سو نہ جاؤں، میں یہیں پہ کھو نہ جاؤں
مجھے ذوق وشوقِ منزل کی ہما ہمی عطا کر

دربار میں حاضر ہے...

سرگشتہ و درماندہ، بے ہمّت و ناکارہ
پسماندہ وسرگرداں، بے مایہ و بے چارہ
شیطاں کا ستم خوردہ، اس نفس کا دکھیارا
ہر سمت سے غفلت کا گھیرے ہوئے اندھیارا

آج اپنی خطاؤں کا لادے ہوئے پشتارا
دربار میں حاضر ہے اِک بندۂ آوارہ

جذبات کی موجوں میں لفظوں کی زباں گم ہے
عالَم ہے تحیّر کا، یارائے بیاں گم ہے
مضمون جو سوچا تھا، کیا جانے کہاں گم ہے
آنکھوں میں بھی اشکوں کا اب نام ونشاں گم ہے

سینے میں سلگتا ہے رہ رہ کے اِک انگارا
دربار میں حاضر ہے اِک بندۂ آوارہ

آیا ہوں ترے در پر خاموش نوا لے کر
نیکی سے تہی دامن، انبارِ خطا لے کر
لیکن تری چوکھٹ سے امّیدِ سخا لے کر
اعمال کی ظلمت میں توبہ کی ضیا لے کر

سینے میں تلاطُم ہے، دل شرم سے صد پارہ
دربار میں حاضر ہے اِک بندۂ آوارہ

امیّد کا مرکز یہ رحمت سے بھرا گھر ہے
اس گھر کا ہر اِک ذرّہ رشکِ مہ واختر ہے
محروم نہیں کوئی جس در سے، یہ وہ در ہے
جو اس کا بھکاری ہے، قسمت کا سکندر ہے

یہ نُور کا قلزم ہے، یہ امن کا فوّارہ
دربار میں حاضر ہے اِک بندۂ آوارہ

یارب! مجھے دنیا میں جینے کا قرینہ دے
میرے دلِ ویراں کو اُلفت کا خزینہ دے
سیلابِ معاصی میں طاعت کا سفینہ دے
ہستی کے اندھیروں کو انوارِ مدینہ دے

پھر دہر میں پھیلا دے ایمان کا اُجیارا
دربار میں حاضر ہے اِک بندۂ آوارہ

یارب مری ہستی پر کچھ خاص کرم فرما
بخشے ہوئے بندوں میں مجھ کو بھی رقم فرما
بھٹکے ہوئے راہی کا رُخ سوئے حرم فرما
دنیا کو اطاعت سے گلزارِ ارم فرما

کردے مرے ماضی کے ہر سانس کا کفّارا
دربار میں حاضر ہے اِک بندۂ آوارہ

نعت

آپؐ کی نعت کیا کہوں؟ سیّدِ خلق کردگار!
جلوہ گرِ الَست کے سب سے حسین شاہکار

آپؐ کے وصف میں سدا لفظ و بیاں فگندہ سر
آپؐ کی نعت کے حضور شعر ہمیشہ شرمسار

کون و مکاں کی رفعتیں آپؐ کے نقش پا کی دھول
شمس و قمر کے دائرے، آپؐ کی راہ کا غبار

آپؐ ہیں قلب و روح کی سلطنتوں کے تاجور
آپؐ ہیں بامِ قدس پر حسنِ ازل کے راز دار

سیرت وسنت آپؐ کی، باغِ ارم کی راہبر
جس سے ضمیر پُر سکوں، جس سے حیات پُر بہار

ارض وسما سے عرش تک آپؐ کی عظمتوں کی دھوم
پھر بھی ہمارے درد میں فرشِ زمیں پہ اشکبار

آپؐ کی اتبّاع میں دونوں جہاں چمن چمن
زیست بھی جس سے دلنواز، گور وکفن بھی لالہ زار

آپؐ کی ٹھوکروں میں ڈھیر، سارے جہاں کی دولتیں
پھر بھی قبائے مسکنت آپؐ نے کر کے اختیار

ق

کیسا سکوں دلا دیا دنیا کے ہر غریب کو
میری برادری میں ہیں دونوں جہاں کے تاجدار

آپؐ سے پہلے ہر طرف ظلم وستم کا راج تھا
آپؐ کے دم سے کِھل اٹھی عدل کی فصلِ نو بہار

آپؐ کے دم سے دُور کی خالقِ کائنات نے
روحِ زمیں کی تشنگی، چشمِ فلک کا انتظار

صدیوں سے جو حقیقتیں گمرہیوں میں دفن تھیں
آپؐ کی اک پکار سے ہوگئیں ساری آشکار

وہم وگماں کے دشت میں بھٹکے ہوئے تھے قافلے
آپؐ کے دم سے پا گئے علم ویقین کا قرار

جہل کا میل اتار کر، وہم کی گرد جھاڑ کر
اُمّیؐ نے لہلہا دیئے حکمتِ دیں کے سبزہ زار

اتنے درود آپؐ پر جتنی خدا کی نعمتیں
اتنے سلام آپؐ پر جن کا نہ ہوسکے شمار

آپؐ کی دید سے حضورؐ! موت بھی میری عید ہو
داورِ حشر کا کرم سُن لے یہ روح کی پکار

معدنِ علم و حلم کے آپؐ ہیں گوہرِ یتیم
محفلِ زیست ہے سدا جس کی ضیا سے تابدار

ٹوٹے دلوں کے چارہ گر، آپؐ کی گفتگو کے پھول
مرہمِ زخمِ زندگی آپؐ کی تیغِ آب دار

آپؐ ہی افضل الرسلؐ، آپؐ ہی خاتم الرسلؐ
حلقۂ انبیاء میں آپؐ اوّل و آخرِ قطار

آپؐ کے در کی رفعتیں، میرے بیاں کی عاجزی
بس یہی اشک تھے حضورؐ! جن کو میں کر سکا نثار

مسجدِ حرام میں چند تأثرات

حرم کی مقدّس فضاؤں میں گم ہوں
میں جنّت کی ٹھنڈی ہواؤں میں گُم ہوں

میں بیگانہ ہوکر ہر اک ماسوا سے
بس اک آشنا کی وفاؤں میں گُم ہوں

زبانیں جہاں گنگ ہیں، لفظ ششدر
تحیّر کی ایسی فضاؤں میں گم ہوں

میں کعبے کے بے آب اِن پتھروں سے
کرم کی امڈتی گھٹاؤں میں گُم ہوں

کبھی سنگِ اسود کی کرنوں میں حیراں
کبھی ملتزم کی شعاعوں میں گم ہوں

مقفّل ہے در، لُٹ رہے ہیں خزانے
عطا کی نرالی اداؤں میں گُم ہوں

ہر اک دِل سے ظلمت کے دَل چھٹ رہے ہیں
غلافِ سیہ کی ضیاؤں میں گم ہوں

جو میرے گناہوں کو بھی دھو رہی ہیں
میں رحمت کی اُن انتہاؤں میں گُم ہوں

یہ میزابِ رحمت پہ پُر درد نالے
فلک سے برستی عطاؤں میں گم ہوں

یہ زمزم کے چشمے، یہ پیاسوں کے جمگھٹ
زمیں سے ابلتی شفاؤں میں گُم ہوں

جو اِس آستاں کے لگاتے ہیں پھیرے
میں اُن کے جنوں کی اداؤں میں گُم ہوں

کھڑے ہیں بھکاری ترے در کو تھامے
میں اُن کی بلکتی صداؤں میں گُم ہوں

پہنچ جن کی ہے آسمانوں سے آگے
میں اُن عاجزی کی نواؤں میں گُم ہوں

یہ سینے سے اُٹھتی ندامت کی آہیں
میں ان دردِ دل کی دواؤں میں گُم ہوں

یہ کعبے کے درباں، یہ نازوں کے پالے
میں ان کی پیاری جفاؤں میں گم ہوں

تصوّر میں یادوں کی محفل سجی ہے
تخیل کے دلکش خلاؤں میں گُم ہوں

ابھی شرحِ الفت کی منزل کہاں ہے؟
ابھی تو تقیٓ، ابتداؤں میں گُم ہوں

مکہ مکرمہ، ۲۲ ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ
۱۸ ستمبر ۱۹۹۵ء

غزل

احساں یہ اُس گلی کی معطّر فضا کا ہے
پہلو میں کل سے درد ہے، اور انتہا کا ہے

اُس عارضِ حسیں سے فروزاں ہے بزمِ گُل
چرچا چمن چمن اُسی بُوئے قبا کا ہے

آنکھوں میں ابر، لب پہ تبسّم کی چاندنی
کتنا حسیں جواب مری التجا کا ہے

پامال ہو کے تجھ سے ابھی تک ہے سرفراز
یہ کہکشاں، جو عکس تریؔ خاکِ پا کا ہے

بسمل خود اُنؐ کے آگے جھکاتے ہیں گردنیں
خنجر ہے ہاتھ میں، کہ سندیسہ شفا کا ہے

آئی ہے موت، لے کے نیا کیفِ زندگی
قاتل جو ہے مرا وہ مسیحا بَلا کا ہے

بے شک ہر ایک غم کا مُداوا ہے اُن کی یاد
لیکن وہ دردِ دل جو اثر اس دوا کا ہے

اب میری بے خودی کو ہے جلووں کا سامنا
اے دل مدد! یہ وقت بڑے ابتلا کا ہے

کب سے اسی خیال میں بس جی رہا ہوں میں
وعدہ تو ہے، اگرچہ اسی بے وفا کا ہے

اب ہو چلا ہے مجھ کو گوارا غمِ حیات
بس ہو نہ ہو، یہ کام اُسی بے خطا کا ہے

منزل اگرچہ سامنے دوگام ہے مگر
در پیش ایک معرکہ کرب وبلا کا ہے

کس کس ادائے ناز کے قربان جایئے
انعام بھی دیا ہے تو عنواں سزا کا ہے

سر کو چھپا کے رکھّو، نشیمن کی چھاؤں میں
سایہ گلی گلی میں بھٹکتا ہُما کا ہے

معصوم سر بہ خم تھے خطا وار کے حضور
رُتبہ اُس انجمن میں یہ مجھ بے نوا کا ہے

آسیؔ متاعِ قلب کو رکھنا سنبھال کر
قسمت سے اِس گھر پہ دل اُس دلرُبا کا ہے

غزل

فکرِ منزل سے پَرے، سود وزیاں سے آگے
وادیٔ عشق ہے "کیوں" اور "کہاں" سے آگے

عشق کے در پہ ملی راحتِ ایمان ویقیں
عقل بڑھتی ہی نہ تھی وہم وگماں سے آگے

در گہِ حسن میں ٹوٹے ہوئے لفظوں پہ نہ جا
لطفِ اظہار ہے الفاظ وبیاں سے آگے

جس جگہ فکر کی پرواز بھی دَم توڑ گئی
ہے ترےؔ علم کا فیضان وہاں سے آگے

کیسے معلوم ہو تجھ کو کہ مسرّت کیا ہے؟
تو نے دیکھا ہی نہیں عمرِ رواں سے آگے

کرب و حسرت کی قلم رَو تھی ترے غم سے اِدھر
چین ہی چین ہے بس اب تو یہاں سے آگے

غزل

محبّت کیا ہے دل کا درد سے معمُور ہو جانا
متاعِ جاں کسی کو سونپ کر مجبور ہو جانا

ہماری بادہ نوشی پر فرشتے رشک کرتے ہیں
کسی کے سنگِ در کو چومنا، مخمور ہو جانا

قدم ہیں راہِ اُلفت میں تو منزل کی ہوس کیسی؟
یہاں تو عین منزل ہے تھکن سے چُور ہو جانا

یہاں تو سر سے پہلے دل کا سودا شرط ہے یارو!
کوئی آسان ہے کیا سرمدؒ و منصورؒ ہو جانا

بسا لینا کسی کو دل میں، دل ہی کا کلیجہ ہے
پہاڑوں کو تو بس آتا ہے جل کر طُور ہو جانا

مری کوتاہیوں نے تم کو بخشیں رونقیں کیا کیا
خفا ہو کر لجَانا، روٹھ کر کچھ دور ہو جانا

مثالِ شمع اپنی ذات کو پگھلانا پڑتا ہے
بہت مشکل ہے ہمدم ظلمتوں کا نور ہو جانا

نظر سے دور رہ کر بھی تقیؔ وہ پاس ہیں میرے
کہ میری عاشقی کو ننگ ہے مہجور ہو جانا

مری کی شام

مری کی شام، یہ شامِ طرب، یہ پہنائی
یہ رنگ و نور کا مسکن، جہانِ رعنائی

بلند و پست پہ سبزے کی مخملیں پوشاک
دیارِ حسن میں پھولوں کی بزم آرائی

یہ وادیوں میں گھٹاؤں کے جمگھٹے رقصاں
فرازِ کوہ پہ بجلی کی مست انگڑائی

یہ دھوپ چھاؤں کی چُہلیں کھلی فضاؤں میں
یہ عطر بیز ہواؤں کی کوہ پیمائی

شفق کے رنگ سے رُخسارِ کوہ پر غازہ
دھنک کے فیض سے وادی کا جسم چمپائی

یہ سرفراز پہاڑوں پہ برف کی جھیلیں
یہ دلنواز ڈھلانیں اتھاہ گہرائی

یہ نرم نرم پھواروں کے رِم جھمی نغمے
یہ بوندیوں کے پیانو، ہوا کی شہنائی

یہ دیودار کے زینے، یہ حُسن کے پرچم
یہ دلکشی کے منارے، بروجِ زیبائی

یہ ہیبتوں کے، جلال ووقار کے پیکر
فگندہ سَر ہے جہاں طُمطراقِ دارائی

یہ سطحِ کوہ پہ فصلِ بہار کے ڈیرے
یہ رنگ وبُو کے بسیرے، گلوں کی انگنائی

یہ پتھروں کا جگر چیرتے ہوئے چشمے
بساطِ گُل پہ یہ ندیوں کی رقص فرمائی

جمال وحُسن کی ہر گام اِک نئی دنیا
زمیں تمام نظارہ، فلک تماشائی

خود اپنے حُسن کے جلووں میں کھو گئی وادی
یہ ہوچکا تو فضا نے شراب برسائی

دھنک، پہاڑ، شفق، پھول، ندیاں، چشمے
بہار و نکہت و مستی، جمال وزیبائی

قدم قدم پہ یہ رنگیں تجلّیوں کے ہجوم
یہ کثرتوں سے جھلکتی خدا کی یکتائی

یہ مال روڈ، یہ جنّت حسیں نظاروں کی
زمیں پہ جیسے کوئی کہکشاں اُتر آئی

یہ رونقوں کا گلستاں، یہ نکہتوں کا چمن
یہ مستیوں کا جزیرہ، یہ موجِ صہبائی

یہ ولولوں کا خیاباں، جنوں کی راہگذر
یہ فوجِ عقل وخرد کا مقامِ پسپائی

شباب وعیش کا بازار، عشرتوں کا نگر
نشاط و کیف کی بستی، طرب کی انگنائی

یہ رنگ رنگ کے حسن وجمال کا مخزن
یہ انگ انگ میں مستی بھری توانائی

سیہ گھٹاؤں کے گھیرے میں قُمقموں کی قطار
کہ جیسے مانگ میں افشاں کی جلوہ آرائی

یہ آسمان پہ بادل کے سُرمئی استر
یہ پیچ پیچ میں تاروں کی نرم تُرپائی

قدم قدم پہ مچلتے پَرے حسینوں کے
یہ کوہساروں پہ پھرتے غزالِ صحرائی

یہ برف پوش فضاؤں میں آگ کے شعلے
خنک ہواؤں سے دل میں جوان گرمائی

یہ موڑ موڑ پہ اُٹھتی جوانیوں کے ہجوم
نظر نظر سے الجھتے بتانِ رعنائی

یہ رنگ روپ، یہ عشوے، یہ شوخیاں، یہ سنگھار
گداز و نرم لبادے، لباسِ سرمائی

ہر ایک حسن ہے خود اپنے آپ پر نازاں
ہر اک جمال کے جلوے خود اپنے شیدائی

دلوں کو چھیدتی، سینوں میں تیرتی نظریں
خیالِ عصمت وعفّت، خیالِ رسوائی

حیا کے شیشے بہرگام چُور چُور یہاں
ہے تار تار یہاں دامنِ شکیبائی

فصیلِ عقل وخرد میں جگہ جگہ رخنے
قدم قدم پہ شکستہ حصارِ دانائی

رسومِ عفّت وتقویٰ ہیں اک گناہ یہاں
خدا رسول کا جو نام لے وہ سودائی

یہ قہقہے، یہ تبسّم، یہ مستیاں، یہ خُمار
نہ جانے کیوں مری ایسے میں آنکھ بھر آئی

تلاش

افق کے پار جاؤں، جگمگاتے چاند تاروں میں
شفق کی سرخ وادی میں، سحر کے نور پاروں میں
جہاں انگڑائیاں لیتی ہے ہستی، اُن بہاروں میں
اُمڈتے جوئباروں میں، چھلکتے آبشاروں میں

کہاں ڈھونڈوں تجھے اے دوست، میں تجھ کو کہاں ڈھونڈوں

جہاں دوشیزہ کلیوں سے ہوائیں چھیڑ کرتی ہیں
جہاں تصویرِ ہستی میں بہاریں رنگ بھرتی ہیں
جہاں قوسِ قزح کے سائے میں شامیں نکھرتی ہیں
جہاں لیلائے شب کی سانولی زلفیں سنورتی ہیں

کہاں ڈھونڈوں تجھے اے دوست، میں تجھ کو کہاں ڈھونڈوں

تُو اس دنیائے دوں میں پیکرِ مہتاب ہے گویا
مرے افسانۂ ہستی کا رنگیں باب ہے گویا
تو باغِ مہر والفت کا گُلِ شاداب ہے گویا
تُو فصلِ ابر وباراں میں کنارِ آب ہے گویا

کہاں ڈھونڈوں تجھے اے دوست، میں تجھ کو کہاں ڈھونڈوں

مری ہستی کی راہوں پر محبّت کا نشاں تُو ہے
وفا ومہر والفت کی نرالی داستاں تُو ہے
بہاریں تجھ سے تابندہ ہیں، جانِ گلستاں تُو ہے
مری تخییل کا محور، امنگوں کا جہاں تُو ہے
ذرا آواز دے مجھ کو، کدھر ہے تُو؟ کہاں تُو ہے؟

کہاں ڈھونڈوں تجھے اے دوست، میں تجھ کو کہاں ڈھونڈوں

غزل

مجھ سے ہٹ کر دیکھیے، مجھ کو بھُلا کر دیکھیے
میری اُلفت کا فسُوں کچھ دُور جا کر دیکھیے

آئنے کے جھوٹ پر ہر گز نہ کیجے اعتبار
اپنے جلووں کو مری خلوت میں آکر دیکھیے

کیمیا تاثیر ہے یہ ذرّۂ ناچیز دل
گر کسی کی یاد میں اس کو مٹا کر دیکھیے

مرگِ کیفِ عشق ہے ہنگامۂ روزِ وصال
دردِ الفت کا مزا فرقت میں جاکر دیکھیے

بس پسِ مژگاں ہی رکھیے آتشِ سیالِ غم
عمر بھر کی پونجیوں کو کیوں بہا کر دیکھیے

کتنے غنچے مضطرب ہیں دل میں کھلنے کے لیے
اپنے ہاتھوں سے ذرا نشتر لگا کر دیکھیے

حُسن کے ہاتھوں میں پہلے بے نوا بن جایئے
اقتدارِ عشق کا پھر لطف اُٹھاکر دیکھیے

ڈھونڈیئے پھر بحرِ ظلمت میں مُرادوں کے گُہر
کشتیاں پہلے سرِ ساحل جلا کر دیکھیے

خشک پتھر کی رگوں میں منتظر سیرابیاں
تشنگی کی آگ سینے میں لگا کر دیکھیے

غم کے داغوں سے نہ ڈریے، اِن سے پھوٹے گی بہار
اِن گلوں کو طاقِ ہستی پر سجا کر دیکھیے

گرمیٔ گفتار سے جب کچھ نہ حاصل ہو سکے
بے زبانی کی زباں بھی آزما کر دیکھیے

چاہیے آسیؔ اگر لطفِ حیاتِ جاوداں
اپنی ہستی اُن کی چوکھٹ پر فنا کر دیکھیے

غزل

"ڈھونڈیں ہم اب نقوشِ سبک رفتگاں کہاں؟
اب گردِ کارواں بھی نہیں، کارواں کہاں؟[1]"

ہم نے مٹا دیئے ہیں من وتُو کے فاصلے
اب آرزو کو حاجتِ لفظ وبیاں کہاں؟

ہر تارِ پیرہن ہے کمندِ فصیلِ شوق
اُلجھے گی ہم سے گردشِ دوراں کہاں کہاں؟

ناکامیوں میں خوب تھا حالِ دلِ حزیں
اب زندگی میں لذّتِ دردِ نہاں کہاں؟

یہ وہ متاع تھی سرِ منزل جو لُٹ گئی
اب جستجو کو ڈھونڈ کے لاؤں یہاں کہاں؟

درماندگی نے کام دیا ہے بُراق کا
پہنچی دلِ شکستہ کی آہ وفغاں کہاں

اچھا ہے سَر کے بدلے جو سودا ہو عشق کا
"اِک جان کا زیاں ہے، سوایسا زیاں کہاں؟"

ہمدم! میں آشیانہ چمن سے اُٹھا تو لوں
تڑپیں گی پھر مگر یہ حسیں بجلیاں کہاں!

آسیؔ زمیں پہ روح کی بستی اجاڑ کر
انسان چل پڑا ہے سوئے آسماں کہاں؟

غزل

نہاں پردوں میں ہے، جلووں کی تابانی نہیں جاتی
وہ ہستی خود کو منواتی تو ہے، جانی نہیں جاتی

یہ میخانہ ہے، اس میں ہم سے دیوانوں کی چلتی ہے
یہاں عقل و خرد کی سروری مانی نہیں جاتی

رہِ الفت میں اکثر مرحلے ایسے بھی آتے ہیں
کہ پاؤں تھک کے رُک جاتے ہیں، جولانی نہیں جاتی

کمندیں ڈال رکھی ہیں مری ہمّت نے تاروں پر
مگر اب تک دلِ ناداں کی نادانی نہیں جاتی

ہر اک سورج نکلتا ہے نرالی رونقیں لے کر
مگر پھر بھی دلِ ویراں کی ویرانی نہیں جاتی

جبینِ شوق کو یارب بس اپنا آستاں دیدے
کہ مجھ سے در بدر کی خاک اب چھانی نہیں جاتی

یہ علم و آگہی آسی کہاں لے آئے ہیں مجھ کو
کہ اب مجھ سے خود اپنی شکل پہچانی نہیں جاتی

غزل

ابرِ بہار اور برس، ہاں برس ابھی
پیاسے ہیں گلستاں میں بہت خار وخس ابھی

کیا بات کہہ رہی ہے مری آشیاں کی راکھ
مامون ہے بہار سے کنجِ قفس ابھی

ہرگز ترس نہ کھائے کوئی اُن کے حال پر
آتا ہے میرے حال پہ جن کو ترس ابھی

تسخیر کر چکا ہوں میں ماہ ونجوم کو
چلتا نہیں مگر دلِ ناداں پہ بس ابھی

صیاد! اور دام کے حلقوں کو تنگ کر
اُلجھا ہوا ہے سینے سے تارِ نفس ابھی

اے گردشِ زمانہ! مجھے دھمکیاں نہ دے
اُن کے خیال پر ہے مجھے دسترس ابھی

صدیوں سے اس فضا میں مہک ہے بسی ہوئی
گذرا ہے اس گلی سے کوئی جیسے بس ابھی

باتیں سبھی ہیں حضرتِ واعظ کی طرح دار
لیکن نہیں ہے کوچۂ الفت سے مَس ابھی

وہ سامنے تھے، پاس تھے، اتنے قریب تھے
کرنا تھا عقل کو بھی مگر پیش وپَس ابھی

آسیؔ نہ چھیڑ عشق و محبّت کی داستاں
اہلِ خرد کے دل ہیں اسیرِ ہوس ابھی

فصلِ بہار

افسردگی کا میل دلوں سے اُتار کے
لو آ گئے ہیں دن مری فصلِ بہار کے

رحمت کا ایک بابِ حسیں کھل رہا ہے آج
دل سے غبارِ رنج ومحن دُھل رہا ہے آج

راہیں نئی نئی ہیں، خیاباں نئے نئے
دل میں تصوّرات کے طوفاں نئے نئے

کلیاں نئی ہیں، پھول نئے، گلستاں نیا
ہستی نئی، زمین نئی، آسماں نیا

ہر سمت ناؤ نوش کا جوش وخروش ہے
"ہر گوشۂ بساط کفِ گُل فروش ہے"

اُلفت کی دلنواز مہک ہے فضاؤں میں
غم سارے سو گئے غمِ جاناں کی چھاؤں میں

ہستی خود اپنے حسن کے جلووں میں کھو گئی
تاریکیوں کا پاپ کٹا، صبح ہو گئی

دنیائے رنگ و بُو میں نئی محفلیں سجیں
دل کے نگار خانے میں شہنائیاں بجیں

ہر سمت نغمہ ریز محبّت کے آبشار
ہر ہر قدم پہ جلوہ فگن فصلِ نو بہار

الفت کے گیت کانوں میں رس گھولنے لگے
نغمے دلوں سے غم کی گِرہ کھولنے لگے

تنہائیاں

چرخ پر جوشاں خروشاں ابر کی پرچھائیاں
یہ شفق کی شوخیاں، پھولوں کی بزم آرائیاں
شام کی رنگینیاں، موسم کی کیف افزائیاں
آستانِ غرب پر سورج کی جبہہ سائیاں

ہائے یہ پُر کیف موسم، اور مری تنہائیاں

تا بہ دامانِ نظر یہ لہلہاتے سبزہ زار
نوجواں پھولوں کا ہنسنا، ننھی کلیوں کا پیار
اس نشیلی شام میں پُرسوز کوئل کی پکار
سرو کی گاتی لچکتی شاخ کی انگڑائیاں

ہائے یہ پُر کیف موسم، اور مری تنہائیاں

یہ ہوا نغمے سُناتی، ناچتی، گاتی ہوئی
لالہ و گل کے حسیں رخسار سہلاتی ہوئی
زعفرانی کھیت کی رگ رگ میں لہراتی ہوئی
یہ فضائے دلرُبا کی بیکراں پہنائیاں

ہائے یہ پُر کیف موسم، اور مری تنہائیاں

اس چمن کا پتّہ پتّہ دلکش وگُل پوش ہے
ذرّہ ذرّہ اس جہاں کا بیخود ومدہوش ہے
ہے یہ وقتِ مے کشی، ہنگامِ ناؤ نوش ہے
اور مرے دل میں اسی احساس کی گہرائیاں

ہائے یہ پُرکیف موسم، اور مری تنہائیاں

(شرافی گوٹھ کراچی، جولائی ۱۹۶۲ء)

غزل

عشرت سے مجھے کام نہ دنیائے طرب سے
دیکھا ہے نہاں خانۂ دل آنکھ نے جب سے

نزدیک وہ اتنے تھے کہ بس مل گئے دل میں
تھا گرمِ سفر جن کے لیے جانے میں کب سے

گر جنبشِ مژگاں کا کرشمہ ہے یہ دنیا
کیا دھوم مچے گی تری اک جنبشِ لب سے

اے ظلمتِ حالات سے جی چھوڑنے والو!
پَو پھٹتی ہے ہر روز اسی سینۂ شب سے

خوشیوں کے مقدّر میں ہے صدموں کی رفاقت
کانٹے یہ صدا دیتے ہیں پھولوں کے عَقَب سے

اللہ رے چہرے پہ یہ اعجازِ محبّت
رنگ اور نکھر آتا ہے کچھ رنج وتعب سے

دو گام چلے تھے کہ نظر آگئی منزل
مَرکب کوئی بہتر نہ ملا ترکِ طلب سے

پل بھر میں وہ افسانۂ دل کہہ گئیں آنکھیں
برسوں میں بھی جس کو نہ سنا پاؤں میں لب سے

اے صبح کو تنویرِ شفق دیکھنے والو!
پھوٹا ہے یہ رنگ اصل میں قربانیٔ شب سے

کیا کم ہے یہ اعزاز کہ اُس بزم میں آسیؔ
ہے ذکر مرا "ظالم و ناداں" کے لقب سے

غزل

پاس رہ کر جو پاس آ نہ سکا
بھول کر میں اُسے بھلا نہ سکا

ہر وہ انسان آج رہبر ہے
رہزنی میں جو کام آ نہ سکا

ہائے وہ اشکِ رائیگاں جو کبھی
تیرے دامن پہ مسکرا نہ سکا

کیا سناؤں تمہیں فسانۂ دل
اک دیا تھا، جو جگمگا نہ سکا

کیا جیے گا وہ رزمِ ہستی میں
چوٹ کھا کر جو مسکرا نہ سکا

راہِ الفت کا وہ مسافر کیا
ہر قدم پر تجھے جو پا نہ سکا

عصرِ حاضر کا فلسفہ آسیؔ
زندگی کو تو راس آ نہ سکا

غزل

درد سے، یادوں سے، اشکوں سے شناسائی ہے
کتنا آباد مرا گوشۂ تنہائی ہے

خار تو خار ہیں، کچھ گُل بھی خفا ہیں مجھ سے
میں نے کانٹوں سے اُلجھنے کی سزا پائی ہے

میرے پیچھے تو ہے ہر آن یہ خلقت کا ہجوم
اب خدا جانے یہ عزّت ہے کہ رُسوائی ہے

ہاتھ نیکی سے تہی، سر پہ گناہوں کے پہاڑ
سب سہی، دل مگر اِک تیرا ہی شیدائی ہے

پھونک کر ساری تمناؤں کے دفتر، یہ دل
اب تو بس تیری تمنّا کا تمنائی ہے

اُن کا دیدار تقیّ کیسا قیامت ہوگا
جب فقط اُنکے تصور میں یہ رعنائی ہے

غزل

جہاں میں جز ترے جلووں کے چار سُو کیا ہے
یہ بزمِ شمس و قمر کیا ہے؟ رنگ و بُو کیا ہے؟

نظر نظر میں فروزاں ہیں تابشیں تیری
مگر یہ راز نہ اب تک کھلا کہ تُو کیا ہے

تری تلاش میں نکلے تو یہ ہوا معلوم
جنونِ شوق کی منزل ہے، جستجو کیا ہے

کسے خبر ہے کہ اے میرے دیدۂ حیراں
نمازِ عشق سے پہلے ترا وضو کیا ہے

بس اِک ادائے محبّت، بس اک نگاہِ کرم
دلِ شکستہ کا اس کے سوا رفُو کیا ہے؟

رضائے دوست کے آگے یہ خواہشیں کیسی؟
خلوصِ عشق کا مقتل ہے آرزُو کیا ہے

کہاں کی عزّت وشوکت، کہاں کا جاہ وحشم
سوائے انؐ کی غلامی کے آبرو کیا ہے؟

وہ جان کیا جو نہ ہو خرچ تیرے رستے میں
جو تیرے در پہ نہ بہہ جائے، وہ لہو کیا ہے؟

سکوت کیا، جو نہ ہو تیری یاد سے آباد
جو تیرے ذکر سے خالی ہو گفتگو، کیا ہے

ہمیں ملے ہیں وہ ساقی جنہیں نہیں معلوم
شرابِ ناب ہے کیا چیز اور سبُو کیا ہے

یہ حادثات ہیں خود تیرے واقعات کا عکس
اِک آئنہ ہے تقیؔ تیرے رُو برُو کیا ہے

غزل

مری عمرِ رواں ہے اور میں ہوں
یہ سوزِ جاوداں ہے اور میں ہوں

مرے پاؤں ہیں، اور پاؤں کے چھالے
غبارِ کارواں ہے اور میں ہوں

بہت مشکل ہے اظہارِ محبّت
جہانِ بدگماں ہے اور میں ہوں

میں ہر محفل میں انساں ڈھونڈتا ہوں
یہ سعیِ رائیگاں ہے اور میں ہوں

کہاں ہے اے غمِ دل تو کہاں ہے؟
بہاروں کا سماں ہے اور میں ہوں

بہت پُرکیف ہیں آسیؔ یہ لمحے
کسی کا آستاں ہے اور میں ہوں

اے وادیٔ کشمیر!

تو حُسن کا پیکر ہے، تو رعنائی کی تصویر
مخمور بہاروں کے حسیں خواب کی تعبیر
رخشاں ہے ترے ماتھے پہ آزادی کی تنویر
تو جلوہ گہِ نورِ جہاں، نورِ جہانگیر

اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

ہر لمحہ مچلتی ہیں ترے من میں بہاریں
میخانہ در آغوش درختوں کی قطاریں
چشموں کے ترانے ہیں کہ ساون کی ملھاریں
ندیوں میں تری نغمۂ آزادی کی تفسیر

اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

کیوں تیری فضاؤں پہ اُداسی کے نشاں ہیں
نکھرے ہوئے گلزار بھی کیوں محوِ فغاں ہیں
چشمے ترے کیوں نالہ کش و نوحہ کناں ہیں
کہسار ترے کیوں ہیں جگر بستہ و دِلگیر

اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

شاید تجھے مسلم کی وفاؤں سے گِلا ہے
فریاد تری سچ ہے، ترا شکوہ بجا ہے
لیکن مرے محبوب وہ وقت آن لگا ہے
گونجے گا فضاؤں میں جب اک نعرۂ تکبیر

اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

مانا کہ دلوں میں وہ تب وتاب نہیں ہے
اس قوم کی تلوار میں وہ آب نہیں ہے
اب عزمِ مسلماں بھی وہ سیلاب نہیں ہے
گردش میں ہے برسوں سے مری قوم کی تقدیر

اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

مانا تری مٹی پہ بہت خون بہا ہے
تو نے غم وآلامِ غلامی کو سہا ہے
لیکن مرے ہمدم! مرا دل بول رہا ہے
ہمّت کی حرارت سے پگھل جائے گی زنجیر

اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

تکبیر کا نعرہ تری عصمت کا امیں ہے
چھٹنے کو ہے تاریکیٔ غم، مجھ کو یقیں ہے
کیا ظلمتِ شب صُبح کی تمہید نہیں ہے؟
کیا خونِ شفق رنگ نہیں مژدۂ تنویر؟

اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

اب وقت ہے سینوں میں عزائم کو جگا لیں
ہم جام وسبُو توڑ کے تلوار اٹھا لیں
ہر راہِ گلستاں کو کمیں گاہ بنا لیں
کمزور ہے، لیکن ابھی ٹوٹی نہیں شمشیر

اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

ہیں یاد ابھی خالدؓ و طارقؒ کے فسانے
کچھ دُور نہیں احمدؒ و ٹیپوؒ کے زمانے
اٹھو، کہ چلیں ظُلم کو دنیا سے مٹانے
پھر زندہ کریں دہر میں یہ اسوۂ شبّیرؓ

اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

ہم کو ترے شاداب نظاروں کی قسم ہے
جہلم کے دلآویز کناروں کی قسم ہے
پھولوں کی، درختوں کی، چناروں کی قسم ہے
کاٹیں گے ترے پاؤں سے ہر ظُلم کی زنجیر

اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

سر حُرمتِ توحید پہ کٹوا کے رہیں گے
ہم کُفر کے طوفان سے ٹکرا کے رہیں گے
طاغوت کے ایوان کو اب ڈھا کے رہیں گے
پیوندِ زمیں ہوگی ہر اک کفر کی تعمیر

اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

اک غلغلۂ نعرۂ تکبیر اٹھا کر
یہ برقِ تپاں خرمنِ باطل پہ گرا کر
توپوں سے برستے ہوئے شعلوں میں نہا کر
ہم خوں سے لکھیں گے تری آزادی کی تحریر

اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

دشمن کے عزائم تری مٹّی میں ملیں گے
مدّت سے جو رِستے ہیں ترے زخم، سِلیں گے
اس خاک پہ الفت کے حسیں پھول کھلیں گے
صیّاد جو اب تک تھا وہ بن جائے گا نخچیر

اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

پھوٹیں گے تری خاک سے پھر نُور کے دھارے
ظلمت کدۂ کفر سے اٹھیں گے شرارے
گونجے گی اذانوں کی صدا ڈل کے کنارے
پھر جاگ اٹھے گی تری سوئی ہوئی تقدیر

اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

تو خاتمِ دنیا کا اک انمول نگیں ہے
تو حُسن کا مسکن ہے، بہاروں سے حسیں ہے
آسیؔ کی نگاہوں میں تُو فردوسِ زمیں ہے
فردوس تو ہوتی نہیں شیطان کی جاگیر

اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

(جون ۱۹۶۵ء)

بی آر بی کینال

بی آر بی اُس نہر کا نام ہے جس کے کنارے ۱۹۶۵ء کے جہاد میں بھارتی فوج کا راستہ روکا گیا، اور جہاں ملک کی موت وحیات کا معرکہ برپا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس نہر کے ذریعے بھارتی عزائم کو خاک میں ملا کر ملک کو محفوظ رکھا۔ جہاد کے بعد جب سب سے پہلے اس نہر پر جانے کا اتفاق ہوا تو یہ چند اشعار موزوں ہو گئے۔

بی آر بی، سلام ہوں تجھ پر ہزار بار
قائم ہے تجھ سے ملّتِ اسلام کا وقار

تجھ سے عیاں ہیں ملّتِ بیضا کی عظمتیں
تجھ سے جگر فروزیٔ مسلم ہے آشکار

توڑا ہے تُو نے نشّۂ پندارِ کفر کو
تو نے کیا ہے دامنِ باطل کو تار تار

تجھ پر ہوا ہے دبدبۂ ہند سر نگوں
قدموں میں تُو نے روند دیئے کفر کے حصار

جھیلے ہیں تُو نے سینے پہ خونریز معرکے
تجھ سے ہوا ہے لشکرِ اسلام کامگار

تجھ سے ہے ارضِ پاک کا ہر ذرّہ سر بلند
"تجھ سے بنائے عظمتِ اسلاف استوار"

لاہور کی فضاؤں میں توپوں کی گھن گرج
ٹینکوں کی یورشوں سے اڈتا ہوا غبار

ہر موج تیری نُور کی موجِ سبک خرام
دشمن پہ تیغ بن کے چلی وقتِ کارزار

تُو امن کے زمانے میں سیلابِ نُور ہے
لیکن بوقتِ جنگ ہے تو ایک جوئے نار

غزل

معصوم تھا، نہ وقفِ سجود و دُعا تھا میں
خوبی مری یہی تھی کہ اہلِ خطا تھا میں

اب تک میں اپنی ذات کے پنجرے میں بند ہوں
پل بھر کو اپنے آپ کے پیچھے چلا تھا میں

ابلیس ہے مرے لیے اک امتحاں تو کیا؟
ابلیس کے لیے بھی تو اک ابتلا تھا میں

چل چل کے پھٹ چکے ہیں قدم، پھر بھی رہبرو!
اب بھی وہیں کھڑا ہوں جہاں سے چلا تھا میں

سچ سچ کہو کہ ہجر کی تاریک رات میں
ایسا بھی کوئی پل تھا کہ تُم سے جُدا تھا میں؟

اس لغزشِ حسیں پہ فدا لاکھ منزلیں
اپنا وجود کھو کے تمہیں پا گیا تھا میں

غزل

دید آخر حسرت دیدار ہوکر رہ گئی
آنکھ اٹھی تھی، مگر بیکار ہوکر رہ گئی

کیا کہوں کیا چیز ہے تجھ بن یہ فصلِ نو بہار
ہر مہکتی شاخِ گُل تلوار ہوکر رہ گئی

تجھ سے پہلے تو فقط جینا ہی مشکل تھا مجھے
اب تو مجھ پر موت بھی دشوار ہوکر رہ گئی

یوں سجائے نفس نے چھپ چھپ کے دل میں بتکدے
شیخ کی تسبیح بھی زنار ہوکر رہ گئی

تب کہا دل کھول کر دل نے بھی اپنا ماجرا
قوت گویائی جب بیکار ہوکر رہ گئی

پہلے بیماری کو رہتی تھی دوا کی جستجو
اب دوا مجھ کو خود اک آزار ہوکر رہ گئی

کس قدر معجز نما تھی اک نگاہِ نیم کش
زندگی تصویرِ حسنِ یار ہوکر رہ گئی

کون بتلاتا چمن میں صحنِ گلشن کا مآل
ہر کلی لیکن لبِ اظہار ہوکر رہ گئی

شام فرقت نے نکھارا رُخ پہ بیتابی کا نور
ظلمتِ شب مطلعِ انوار ہوکر رہ گئی

ہائے عورت پر یہ تہذیب فرنگی کا ستم
ایک نازک پھول تھی، بازار ہوکر رہ گئی

مال وزر کی گنتیوں کو عیش و عشرت جان کر
زندگی ساری بس اک آزار ہوکر رہ گئی

غزل

چمن پر پھر بہاروں کا سماں ہے
کہاں ہے اے غمِ دل! تو کہاں ہے

یہ کس منزل کی جانب دِل رواں ہے
کہ ہر ذرّہ یہاں اک آستاں ہے

خدایا رہنماؤں کی یہ کثرت
بڑے خطرے میں اب کے کارواں ہے

جہاں وہ سر جھکا دیں سنتے سنتے
وہیں تو اصل لطفِ داستاں ہے

مبادا کل کو سنگِ راہ نکلے
یہ جس پر آج منزل کا گماں ہے

والد ماجدؒ کی وفات پر

کیوں تیرہ و تاریک ہے نظروں میں جہاں آج
کیوں چھائے ہیں ہر سمت یہ ظلمت کے نشاں آج

کیا نخلِ تمنّا کو مرے آگ لگی ہے
سینے سے جو رہ رہ کے یہ اٹھتا ہے دھواں آج

رفتارِ تنفّس ہے کہ چلتے ہوئے آرے
اک جرعۂ زہراب ہے یہ شربتِ جاں آج

کیا حضرتِ والدؒ کو قضا لے کے چلی ہے؟
اِک قافلۂ نُور ہے گردوں پہ رواں آج

ابّا مرے جنّت کے بسانے کو چلے ہیں
اے موت! ترا مرتبہ پہنچا ہے کہاں آج؟

یوں برق وشرر نے مرا پھونکا ہے نشیمن
باقی ہے کوئی شاخ، نہ تنکوں کا نشاں آج

اب زیست کا ہر مرحلہ نظروں میں کٹھن ہے
گردابِ بلا خیز ہے یہ عُمرِ رواں آج

کانٹوں کا بچھونا ہے ہر اک تختۂ گُل بھی
چبھتی ہے مری روح میں خوشبوئے جناں آج

بازی کبھی ہم زیست میں ہارے نہ تھے کوئی
تُو جیت گئی ہم سے مگر فصلِ خزاں آج

دل میں وہ تلاطُم ہے کہ ہلچل سی مچی ہے
اور آنکھ ہے ظالم کہ بس اک خشک کنواں آج

وہ والدِ مشفق، وہ مرے شیخ و مُربّی
کس دیس کی بستی میں ہیں آرام کُناں آج

کیا سچ ہے کہ اب اُن کو نہ میں دیکھ سکوں گا؟
یا دیکھ رہا ہوں میں کوئی خوابِ گراں آج

وہ چہرۂ تابندہ کی پُر نور ضیائیں
صدحیف، کہ ہیں خاک کے تودے میں نہاں آج

وہ پھول چُنا میرے گلستاں سے اجل نے
جس پھول کی خوشبو سے معطّر ہے جہاں آج

وہ اسوۂ اسلاف کی رخشندہ علامت
اے خاک بتا! تُو نے چھپائی ہے کہاں آج

وہ عظمتِ اسلام کا تابندہ ستارا
توصیف سے جس کی مری عاجز ہے زباں آج

وہ مشعلِ ایمان، کہ بھٹکے ہوئے راہی
پاتے ہیں جسے دیکھ کے منزل کا نشاں آج

وہ معرفت وعلم کا مہتابِ فروزاں
ہے چشمِ فلک! کون سی بدلی میں نہاں آج

وہ گنجِ گراں مایہ علومِ نبویؐ کا
عالَم میں اسی فیض کے دریا ہیں رواں آج

وہ مفتیؒ اعظمؒ، وہ معارف کا خزینہ
وہ جس کے فتاویٰ سے منوّر ہے جہاں آج

کس شان سے قرآں کے بکھیرے ہیں معارف
دنیا ہے کہ اک سلسلۂ کاہکشاں آج

وہ اشرفؒ و محمودؒ کا اک ذکرِ سراپا
وہ انورؒ و شبیّرؒ کا اندازِ بیاں آج

وہ بیکس ومظلوم کی آہوں کا سہارا
کیا ہوگیا وہ مرہمِ افسردہ دلاں آج

یہ مسندِ افتا ہے کہ ویران پڑی ہے
اور علم کی محفل میں ہے اک ہُو کا سماں آج

اب کون بنے داروئے غم ہائے زمانہ؟
کس کو ہے مسلماں کا غمِ سود وزیاں آج

اب کون ہے دنیا میں جو پوچھے گا تقیؔ کو
کس فکر میں ہے؟ کیوں نہیں آیا؟ ہے کہاں آج؟

دنیا ہے مرے دوستو! مٹّی کا گھروندا
اور زندگی اک کارگہِ شیشہ گراں آج

باقی کوئی دنیا میں رہا ہے، نہ رہے گا
جانا ہے اُسے کل، وہ جو آیا ہے یہاں آج

دیکھو تو ہر انساں کے تعاقب میں اجل ہے
سوچو تو لبِ گور ہے ہر پیر وجواں آج

جو مرکزِ الفت تھے، جو گلزارِ نظر تھے
سڑتے ہیں تہِ خاک وہ اجسامِ بُتاں آج

وہ دبدبہ جن کا تھا کبھی دشت وجبل میں
وہ تاجِ سکندر ہے، نہ وہ تختِ کِیاں آج

وہ جن کے تہوّر سے دہلتی تھیں زمینیں
ڈھونڈے سے بھی اُن کا کہیں ملتا ہے نشاں آج؟

تھیں جن کی جَھلاجھل سے چکاچوند نگاہیں
حسرت کے کھنڈر ہیں وہ محلّاتِ شہاں آج

جن باغوں کی نکہت سے معطّر تھیں فضائیں
ہے مرثیہ خواں ان پہ ببولوں کی زباں آج

دنیا تو بس اک مرحلہ ہے راہِ عدم کا
اور موت کے محمل میں ہے رختِ دل وجاں آج

ناگاہ کوئی دم میں یہ لَد جائے گا ڈیرا
دھوکے ہیں یہ سب، جن پہ ہے منزل کا گماں آج

آسیؔ یہ غنیمت ہیں تری عمر کے لمحے
وہ کام کر اب تجھ کو جو کرنا ہے یہاں آج

(۱۹۹۶ء)

تاثرات

اپنے مرحوم بھائی جان جناب محمد زکی کیفیؔ کی وفات پر

بتاؤں کیا؟ کہ شکستہ ہیں سب زبان و قلم
نہ اِس میں تابِ بیاں ہے، نہ اُس میں تابِ رَقم

کہ بھائی جان کے اٹھنے کے بعد دنیا میں
ہر ایک بزم ہے بے جان، ہر خوشی بے دَم

وہ بھائی جان، کہ تھے رونق و بہارِ چمن
وہ جن کے دم سے تھا الفت کی محفلوں کا بھرم

وہ ایک جوئے تبسّم، وہ ایک موجِ بہار
وفا و مہر و محبت کی بزم کے محرم

وہ ایک حق و صداقت کی گونجتی آواز
وہ عشق و مذہب و دانش کا منفرد سنگم

ہر ایک حال میں راضی رضائے خالق پر
ہجومِ غم میں بھی خنداں، شگفتہ وخرم

وہ دُور دُور سے بس ایک پیکرِ سادہ
مگر قریب سے پرکھو تو نازشِ عالم

وہ آج اُجاڑ کے ہر محفلِ نشاط وسکوں
چلے گئے ہیں بڑھانے جمالِ ملکِ عدم

روش روش پہ مہکتی ہے یاد یاد اُن کی
ہر ایک راہ پہ کندہ ہیں اُن کے نقشِ قدم

خوشا وہ دور کہ ہر لمحہ تھا پیامِ طرب
جہاں میں مثلِ گُل ولالہ جی رہے تھے ہم

کہاں یہ وقت کہ سُونی ہیں بستیاں دل کی
شعاعِ مہر بھی لگتی ہے جیسے تیرِ ستم

اگرچہ سینے میں دل آج بھی دھڑکتا ہے
پَہ ایک شعلۂ افسردہ، اِک شرارِ الم

ہر ایک گام ہے واماندہ کاروانِ حیات
اُداس اُداس ہیں راہیں، تھکے تھکے سے قدم

بُجھی بُجھی سی سحر ہے، دھواں دھواں شامیں
ہر ایک نغمہ ہے فریاد، ہر صدا ماتم

اُداسیوں نے بٹھائے ہیں روح پہ پہرے
ہر ایک لمحہ مسلّط ہے دل پہ لشکرِ غم

نہ قہقہے، نہ تبسّم، نہ آرزو، نہ اُمنگ
عجیب ساکت و صامت ہے قلب کا عالم

سُنو، کہ زندہ و پائندہ ہے فقط وہ ذات
کہ جس کے حکم سے قائم ہے گنبدِ نیلم

سوائے اُس کے ہر اک شے بساطِ دنیا کی
فنا کی سمت سفر میں ہے ہر گھڑی، ہر دم

رواں دواں ہیں اسی سمت قافلے ہر سُو
اسی تلاش میں پھرتی ہے زندگی پیہم

قضا ہر ایک کی حق ہے، کہ اُس کے ہاتھوں سے
ولی بچے نہ پیمبر، نہ حاتم و رستم

وہ کج کُلاہ کہ لرزاں تھے جن سے دشت و جبل
وہ شرق و غرب میں جن کے گڑے ہوئے تھے علَم

وہ کبر و ناز کے پُتلے بھی بے نشاں ہوئے
نہ کیقباد و سکندر رہے، نہ جام، نہ جم

سدا سے رِیت یہی ہے جہانِ فانی کی
کسی کے لب پہ ترانے کسی کے گھر ماتم

مگر نہ اس میں خطاوار گردشِ دوراں
نہ آسمان بچارے کا کوئی ظلم و ستم

تجلّیاں ہیں کسی حُسن کی یہ بود ونبود
کسی جمال کا پرتَو ہیں سب، وجود وعدم

یہ خوب و زِشت کا آمیزہ ہے بساطِ زمیں
ہر ایک ذرّے میں پنہاں ہیں سیکڑوں عالَم

ہر اک خوشی میں کھٹکتے ہیں رنج کے کانٹے
نہ دائمی ہے مسرّت، نہ پائیدار ہے غم

ہر ایک چاند کے سینے میں داغ پنہاں ہے
ہر ایک پھول کے عارِض پہ قطرۂ شبنم

غم والم ہو، خوشی ہو، کہ عیش وعشرت ہو
ہر ایک موجِ تغیّر میں ہیں ہزار حِکَم

یہ ایک نظمِ پُراسرار ہے کہ صدیوں سے
چلا رہا ہے جسے اک ارادۂ محکم

جُڑا ہوا ہو تعلّق خدا سے جس دل کا
بس اُس کی راہ ہے سیدھی، نہ کوئی پیچ نہ خَم

یہاں کی اصل متاعِ عزیز تقویٰ ہے
نہ کوٹھیاں ہیں، نہ کاریں، نہ مال و جاہ و حَشَم

اسی متاع سے اپنے سفر کا ساماں کر
کہ مثلِ شمع تری عُمر ہو رہی ہے کم

فراق و وصل کی باتیں ہیں سطح کی، ورنہ
وہاں بھی اُن کا کرم تھا، یہاں بھی اُن کا کرم

کم آہ آہ کرو اب، کہ حضرتِ کیفی
چلے ہیں خاکِ حرم سے بسوئے کاخِ اِرم

۱۹۸۷ - ۱۲ = ۱۹۷۵

آخری مصرعے کے اعداد ۱۹۸۷ء ہیں، اس میں سے "آہ آہ" کے ۱۲ عدد کم کردیئے جائیں تو یہ بھائی جان کی تاریخِ وفات ہے، یعنی ۱۹۷۵ء۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

کراچی، یکم ربیع الاول، ۱۳۹۵ھ

ایک اور تاثر

بھائی جان مرحوم ہی کی وفات پر ایک اور تاثر اس طرح موزوں ہوا

دوستو! کیسی قیامت کی یہ رات آئی ہے
تیرگی جس کی دل و روح پہ منڈلائی ہے

کس قیامت کا اندھیرا یہ اُتر آیا ہے
کیوں یکایک مرا دل خوف سے گھبرایا ہے

کیسے سنگین خیالات ستاتے ہیں مجھے؟
کچھ بھیانک سے ہیولے نظر آتے ہیں مجھے

دل میں کیوں ٹیس ہے، سینے میں یہ کیسا غم ہے؟
ساتھیو! کچھ تو بتاؤ کہ یہ کیا عالَم ہے

تھی خلش دیر سے دل میں، مگر ایسی تو نہ تھی
شام سے دل پہ اداسی تھی، پر ایسی تو نہ تھی

چاند تاروں میں چمک، نور ثریا میں نہیں
کیا مرے بھائی زکی اس بھری دنیا میں نہیں

کیا کہوں؟ سینۂ مہجور پہ کیا بیت گئی؟
آہ اے گردشِ ایام! کہ تُو جیت گئی

یہ خبر والد ماجدؒ کو سناؤں کیسے؟
داغ جو دل میں سلگتے ہیں دکھاؤں کیسے؟

والدہ کے دلِ صد چاک کا درماں کیا ہو
صالحہ بھابی کی تسکین کا ساماں کیا ہو

کس طرح آج میں دلدارئ محمودؔ کروں
دل ذرا ٹھہرے تو دل جوئی مسعودؔ کروں

اب سعودؔ اور زہیراؔ کو ہنساؤں کیونکر؟
آنکھ اب ننھی سمیراؔ سے ملاؤں کیونکر؟

کس کلیجے سے حمیراؔ سے ملاقات کروں
بات ہی آج کچھ ایسی ہے کہ کیا بات کروں؟

بستیاں کتنے دلوں کی تھیں جو ویران ہوئیں
محفلیں کتنی تھیں جو آج سے سنسان ہوئیں

رحم اے آنکھ کہ ہمدرد مری تُو بھی نہیں
کیا مرے غم کے مقدّر میں دو آنسو بھی نہیں

بھائی جان! آج سے رخصت ہے قرار آپ کے ساتھ
گلشنِ زیست کی رنگین بہار آپ کے ساتھ

کیا خبر تھی، ہمیں یہ زہر بھی پینا ہوگا
آپ دنیا میں نہ ہونگے، ہمیں جینا ہوگا

آپ جب بزمِ تصوّر میں چلے آتے ہیں
کتنے خنجر ہیں جو سینے میں اُتر جاتے ہیں

ایک میٹھی سی صدا قلب کو چونکاتی ہے
ایک آہٹ ہے جو ہر آن سُنی جاتی ہے

ہے یہی ایک سبق زیست کے افسانے کا
"زندگی کیا ہے؟ بس اک خواب ہے دیوانے کا"

ایک مہلت ہے، یہ انساں کے سنبھلنے کے لیے
اک سرائے ہے، ذرا ٹھہر کے چلنے کے لیے

یہ قبرستان

بھائی جان کی وفات کے بعد پہلی بار لاہور جانا ہوا تو قبرستان میں اُن کی قبر پر بھی حاضری ہوئی، وہاں سے واپسی پر یہ چند شعر موزوں ہو گئے۔

کسے خبر تھی یہ بے آب و رنگ ویرانے
مری عقیدت والفت کی سرزمیں ہوں گے

یہ اونچ نیچ، یہ قبریں، یہ شبنمی جادے
مری نظر میں بہاروں سے بھی حسیں ہوں گے

کہ بھائی جان ہر اک دل کی رونقیں لے کر
قیامِ حشر تک اس خاک کے مکیں ہوں گے

میں آؤں گا کبھی لاہور کی فضاؤں میں
مگر، پناہِ خدا، وہ یہاں نہیں ہوں گے

ہر ایک پھول یہاں کا چبھے گا سینے میں
یہاں کے سرو و سمن مارِ آستیں ہوں گے

میں اپنے آپ کو بہلاؤں گا یہ کہہ کہہ کر
بس آتے ہوں گے ابھی، وہ یہیں کہیں ہوں گے

غزل

تکلیف اب مرض کی نہ حاجت دوا کی ہے
حالت عجیب کل سے دلِ مُبتلا کی ہے

یہ عارضِ حسیں پہ غضب کی گلابیاں
بخشش یہ دلنواز! ہماری خطا کی ہے

صورت پہ واعظوں کی خدارا نہ جائیو
دل میں صنم ہے، بات لبوں پر خدا کی ہے

چھوٹی آپا!

جب چھوٹی آپا گھر سے رخصت ہوئیں، تو میں ہفتوں اُنہیں یاد کر کے روتا رہا۔ وہ سال میں ایک مرتبہ کراچی آیا کرتیں تو وہ دن میرے لئے عید کے دن ہوتے تھے۔ چنانچہ میں نے کافی عرصے کے بعد ان کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار ایک نظم میں کیا جس میں کہا تھا:

چھوٹی آپا! مری اس نظم کا عنواں تم ہو
تم ہو اس بزم کی تزیین کا ساماں تم ہو

حضرتِ والدِ ماجد کی نگاہوں کا سرور
والدہ کے رُخِ پُرنور کی افشاں تم ہو

تم سے بہنوں کے دلوں میں ہے طرب نغمہ سرا
بھائیوں کے لئے ہر درد کا درماں تم ہو

مہر و الفت کے جہاں پھول مہکتے ہیں سدا
ہاں وہ گلشن، وہ گلستاں، وہ خیاباں تم ہو

جس جگہ شور ہے انسانوں کی افزونی کا
اُس جہاں میں بھی جو ملتا نہیں انساں، تم ہو

بے رخی اور لگاوٹ کے ان اندھیاروں میں
روشنی جس سے ہے، وہ شمعِ فروزاں، تم ہو

تم سے ہے میری نظر میں رُخِ ہستی پہ نکھار
جس سے ہے بزمِ محبت میں چراغاں، تم ہو

تم سے چونک اُٹھتی ہیں ارمانوں کی نورس کلیاں
عید کا چاند ہو تم، صبحِ بہاراں تم ہو!

لوریوں میں بھی مجھے درس دیئے ہیں تم نے
ہاں مری بہن، مری دوست، مری ماں تم ہو!

جب میں نے یہ نظم انکی کراچی آمد کے موقع پر انہیں سنائی تو لاہور
واپس جا کر انہوں نے اسی بحر اور قافیے میں مجھے
یوں جواب دیا:

چھوٹے بھائی! مری اس نظم کا عنواں تم ہو
آنکھ کا نور ہو، تسکینِ دل وجاں تم ہو

تم سے میکے کی فضاؤں میں ہے اک کیفِ نشاط
کیا چمن زار ہے وہ جس کی بہاراں تم ہو!

آنکھ کا نور ہو، والد کے جگر کی راحت،
والدہ کیلئے تسکین کا ساماں تم ہو!

بھائی کے خونِ شجاعت میں حرارت تم سے
اور بہنوں کا مچلتا ہوا ارماں تم ہو

سب سے چھوٹے ہو، تمہیں پیار ہے سب کا حاصل
ہے دلوں پر بھی حکومت، وہ سلیماں تم ہو

دیکھ کر تم کو مرے دور ہوں سب رنج و محن
بھول جاؤں جسے پا کر، غمِ دوراں، تم ہو!

ہیں مرے گلشنِ ہستی میں بہاریں تم سے
کشتِ دل جس سے ہے سیراب وہ باراں تم ہو

تم سے کھلتے ہیں یہ ارمانوں کے نورس غنچے
جس میں یہ پھول مہکتے ہیں، وہ داماں تم ہو

دل ہے یا علم کے انوار کا آئینہ ہے!
درس دیتا ہے جو پیہم، وہ دبستاں تم ہو

جہل والحاد کے بڑھتے ہوے اندھیاروں میں
روشنی جس سے ہے وہ شمعِ فروزاں تم ہو

الغرض حمد اُسی ذات کی زیبا ہے مجھے
جسکا انعام ہو تم، رحمتِ یزداں تم ہو

پیامِ رخصت

اپنی بیٹی ماریہ کی شادی کے موقع پر

ماریہ! اے مری گلزارِ نظر، روحِ جگر
کیسے بتلاؤں مرے واسطے کیا چیز ہے تُو
تجھ سے شاداب ہے ہر دم مرا صحرائے وجود
جس میں پھوٹی ہے سدا تیری وفا کی خوشبو

ایک نایاب سے ہیرے کی طرح جانِ پدر!
میں نے جس روز کی خاطر تری سیوا کی تھی
میری دشوار مسرّت کا وہ دن آ ہی گیا
جس کی ڈر ڈر کے مرے دل نے تمنّا کی تھی

اپنے پُرخار مشاغل کے کٹھن لمحوں میں
تیری معصوم اداؤں کا سہارا تھا مجھے
دیکھ کر تیرے لبوں پر یہ تبسم کی کرن
جو بھی طوفانِ مشقّت ہو، گوارا تھا مجھے

کیسی دن بھر کی تھکن ہو، تری باتوں کی مٹھاس
مجھ سے ہر رنج کا احساس مٹا دیتی تھی
اپنی گلبار وفاؤں کا سہارا دے کر
تو مرے ذہن سے ہر فکر بھلا دیتی تھی

سوچتا ہوں دلِ بیتاب پہ کیا گذرے گی؟
تیرے کمرے میں تجھے جب میں نہیں پاؤں گا
دل تو مجبور ہے، آواز تو دے گا تجھ کو
تیری آواز نہ آئے گی تو گھبراؤں گا

آفریں ہے تری ماں پر جو ہے اک پیکرِ ضبط
تیری رخصت کے کیئے شوق سے ساماں اس نے
جس نے پالا تھا سدا پلکوں کی چھاؤں میں تجھے
دل ہی میں گھونٹ لیے اشکوں کے طوفاں اس نے

یہ تو جذبات تھے بیٹی! مگر اب عقل کی بات
بڑی حکمت سے بنایا ہے خدا نے یہ نظام
اس کے کانٹوں ہی سے کھلتے ہیں مسرت کے گلاب
صبحِ عشرت کی بشارت ہے جدائی کی یہ شام

بوئے گل، ابرِ کرم، نورِ چراغ وانجم
فیض پھیلانے کو مرکز سے جدا ہوتے ہیں
دل سدا جیتے ہیں جذبات کی قربانی نے
شمع جلتی ہے تو پروانے فدا ہوتے ہیں

دیکھ شاہینؔ نہ میکے سے جدا ہوتی اگر

تجھ سی دولت ترے میکے کو کہاں ہوتی نصیب؟

تو جو اب مجھ سے جدا ہو کے چلی جائے گی

تیری مہکار سے مہکے گا گلستانِ نجیبؔ

جب مچے گی ترے عمرانؔ کے دل میں ہلچل

قلبِ حسّانؔ میں یادوں کا بسیرا ہوگا

صائمہؔ اور بھتیجے تجھے ڈھونڈیں گے یہاں

تب وہاں عہدِ مسرت کا سویرا ہوگا

تیری یادوں سے میں جب دل کو کروں گا آباد

تب وہاں گلشنِ ہستی میں بہار آئے گی

جگمگائیں گے سدا تیری وفا کے جگنو

اک نئی زندگی عشرت بہ کنار آئے گی

وقت آیا ہے کہ اُس گھر کو اب آباد کرے
تیری خدمت کا، محبّت کا، اطاعت کا خمیر
اِک نئی صبح کے انوار فروزاں کردے
حسنِ سیرت کی ضیاء، مہر و وفا کی تنویر

تجھ پہ اللہ کی رحمت کی گھٹائیں برسیں
اُس کے انعام سے تو نورِ سراپا بن جائے
گھر کے ہر فرد کا ہر دم تجھے وہ پیار ملے
تیری سسرال بھی تیرے لیے میکا بن جائے

جا مری نورِ نظر! اب تری منزل وہ ہے
کتنی مشتاق نگاہوں کی حسیں آس ہے تُو
جب تُو الفت کا نیا عہد سنوارے گی وہاں
میں یہ سمجھوں گا کہ ہر آن مرے پاس ہے تُو

۲۶ ذیقعدہ ۱۴۲۹ھ
۲۹ دسمبر ۲۰۰۵ء

جذباتِ مسرّت

بتقریب شادی خانہ آبادی عزیزم حسّان اشرف سلمہ
۱۳ شوال المکرم ۱۴۲۸ھ مطابق ۲۶ اکتوبر ۲۰۰۷ء

حسّانؔ بنے دولہا
خوشیوں کی وہ رُت آئی

پیکر میں شمیلہؔ کے
رحمت کی گھٹا چھائی

ہر روح پہ منڈلائی
ہر شاخ پہ اٹھلائی
زیبائی و رعنائی
اس طرح بہار آئی

پیکر میں شمیلہؔ کے
رحمت کی گھٹا چھائی

حسّانؔ کے گلشن میں
سج دھج ہے بہاروں کی
بارات سی اُتری ہے
رنگین نظاروں کی

رنگین نظاروں کی
پھولوں کی قطاروں کی
الفت بھرے تاروں کی
بارات اتر آئی

پیکر میں شمیلہؔ کے
رحمت کی گھٹا چھائی

الفت بھرے تاروں سے
دل دل میں چراغاں ہے
اخلاص کی خوشبو سے
ہر سانس گلستاں ہے

ہر سانس گلستاں ہے
فردوس بہ داماں ہے
مہکار کا ساماں ہے
کہتی ہے یہ شہنائی

پیکر میں شمیلہؔ کے
رحمت کی گھٹا چھائی

آباد مری وادی
پھولوں کی قطاروں سے
مسرور ہے ہر ٹہنی
ان ننھے سواروں سے

ان ننھے سواروں نے
ان راج دلاروں نے
گل رنگ بہاروں نے
دنیا مری مہکائی

پیکر میں شمیلہؔ کے
رحمت کی گھٹا چھائی

اس پھولوں کے جمگھٹ میں
جو رُت ہے، سُہانی ہے
یہ صبح کا راجا ہے
وہ رات کی رانی ہے

وہ رات کی رانی ہے
الفت کی کہانی ہے
پھولوں کی زبانی ہے
تاروں نے بھی دہرائی

پیکر میں شمیلہ کے
رحمت کی گھٹا چھائی

وہ دیکھو سحر پھوٹی
عمرانؔ کے گلشن میں
پریاں سی اترتی ہیں
شاہینؔ کے تن من میں

شاہینؔ کے تن من میں
ارمانوں کے آنگن میں
امیدوں کے مسکن میں
وہ روشنی لہرائی

پیکر میں شمیلہؔ کے
رحمت کی گھٹا چھائی

اک چاند جو اترا ہے
آنگن مرے اس گھر میں
دنیا ہے مرے دل کی
کرنوں کے سمندر میں

کرنوں کے سمندر میں
ارمانوں کے لشکر میں
آشاؤں کے ساگر میں
ہر لب پہ دعا آئی

پیکر میں شمیلہ کے
رحمت کی گھٹا چھائی

یا رب مرے جوڑے کو
آباد سدا رکھنا
رحمت سے چمن ان کا
ہر آن بھرا رکھنا

رحمت سے بھرا رکھنا
اُلفت سے ہرا رکھنا
پیمانِ وفا رکھنا
اُوپر سے صدا آئی

پیکر میں شمیلہ کے
رحمت کی گھٹا چھائی

سہرا

بتقریب شادی خانہ آبادی عزیزم مسعود اشرف سلمہ

رواں ہے جادۂ الفت پہ پیکرِ مسعوؔد
ادا ادا میں فروزاں نئی سحر کی نمود
قدم قدم پہ فدا کائناتِ عشرت ورنگ
ہر ایک چاپ پہ قرباں صدائے ساز و سرود

بنا ہے صحنِ چمن اک جہانِ نکہت و نور
کچھ اس طرح سے ہوا اب کے فصلِ گُل کا ورود

خوشا یہ گلشنِ دل پر طلوعِ صبحِ بہار
زہے یہ روح کی وادی پہ بارشِ انوار
رہِ حیات پہ اتری ہے عشرتوں کی برات
نئی ادا سے کیا ہے عروسِ جاں نے سنگھار

عرق عرق ہے تری بوئے پیرہن کے حضور
حسیں گلوں کے کٹوروں میں عطرِ فصلِ بہار

مرے دلہا کو مبارک حیاتِ نو کا جمال
یہ اُس کے پھول سے عارض پہ عہدِ نو کی گلال
ہزار نظروں کے ہالے ہیں میرے چاند کے گرد
مگر تلاش میں ہیں کتنی ابرووں کے ہلال

ذرا سا سہرے کو سَرکا کے بے نقاب آجا
کہ آبِ رُخ کی روانی سے انجمن ہو نہال

عروسِ حسن نے الٹی کچھ اس ادا سے نقاب
خجل ہے ابر کے گھونگٹ سے جھانکتا مہتاب
فلک پہ ایک ثریّا کا نقرئی جھومر
ترے گلے میں ہزاروں ہیں زیورِ آداب

حیا کا رُخ پہ وہ غازہ کہ یہ شفق بے رنگ
وفا کا آنکھ میں پانی کہ نیل بھی بے آب

نئی دلہن رہے تسکینِ قلب و جاں بن کر
دلوں کی لوح پہ اُلفت کا اک نشاں بن کر
سدا سجی رہے اسمآ کی مانگ میں افشاں
وفا و مہر و محبّت کی رازداں بن کر

بسی رہے مرے مسعودؔ کی نگاہ میں تُو
زمینِ دل پہ تخیّل کا آسماں بن کر

پیامِ رخصت

اپنی بھتیجی کی اپنے بھانجے سے شادی کے موقع پر

نہ جانے کس دل سے اپنی سارا کو آج رخصت میں کہہ رہا ہوں
سرور و غم کا عجب تلاطم ہے جس کی موجوں میں بہہ رہا ہوں
بڑی امنگوں سے میں نے خود ہی کیا ہے اس دن کا خیر مقدم
مگر میں کچھ خود ہی جانتا ہوں، خوشی جو سینے پہ سہہ رہا ہوں

خوشا وہ دن میری ننھی گڑیا کہ میری گودی کا ہار تُو تھی
جو میرے گھر کے چمن پہ برسی وہ پہلی پہلی پھوار تو تھی
تو اپنی دادی کا مشغلہ تھی، تو اپنے ماں باپ کا کھلونا
جو اپنے دادا کے دل میں پھوٹی وہ عشرتوں کی بہار تو تھی

ہیں گھر کی محدود زندگی میں وہ کیا بتاؤں جو چیز تو ہے
مری بھتیجی ہے، میری بیٹی ہے، میری دنیائے رنگ و بو ہے
ترے تبسم کے بانکپن سے روش روش میری گل بداماں
نہال ہیں جس سے دیدہ و دل وہ بحرِ الفت کی آبجو ہے

چمن چمن گھر کا گوشہ گوشہ تری محبت کے چہچہوں سے
رہی ہے آباد میری دنیا ترے مسرت کے قہقہوں سے
میں جانتا ہوں کہ تیرے جانے سے کیا مرے گھر کا حال ہوگا
کہ تیری یادوں کے کتنے پودے اٹھیں گے اس خاک کی تہوں سے

مگر یہ اے جانِ عم! ازل سے ہمیشہ دستورِ زندگی ہے
نظامِ ہجر و وصال ہی پر یہ محفلِ زیست چل رہی ہے
تجھے نئی بزم اب سجانی ہے اپنی خدمت سے اور وفا سے
یہی ہے مقصودِ زیست تیرا، خدا کو منظور بھی یہی ہے

تمہیں مبارک ہو چھوٹی آپا، کہ اس کی پھوپی بھی ساس بھی ہو
قدم قدم شفقتوں کا پیکر ہو، ایک ماں کی مٹھاس بھی ہو
تمہارے گھر جا کے گرچہ سارآ مری نگاہوں سے دور ہوگی
تمہارے دم سے مگر یہ لگتا ہے جیسے وہ میرے پاس بھی ہو

تجھے مبارک ہو میرے ہاشمؔ! یہ دل کا ٹکڑا ترے حوالے
ترے چمن کا رہیں مقدر مسرتوں کے حسیں اجالے
یہ اپنے حُسنِ ادا سے ہر دم بسے ترے دل کی دھڑکنوں میں
تو میری سارآ کو شاد رکھ کر ہمیشہ میری دلی دعا لے

مسرتوں کے جلو میں سارآ سدا مگن رہ کے مسکرائے
سدا ترے سر پہ ضوفگن ہوں یہ رحمت ایزدی کے سائے
کریں ترا بڑھ کے خیر مقدم خلوص والفت قدم قدم پر
پیار ایسا ملے وہاں پر کہ تجھ کو میکہ نہ یاد آئے

صفر المظفر ۱۴۰۳ھ
۳ دسمبر ۱۹۸۲ء

پیامِ مسرت

اپنے بھانجے مولانا امین اشرف سلمہ کی شادی پر میری بہن
اور ان کی والدہ کی طرف سے پیش کیا گیا

تمہیں امینؔ مبارک حیات نو کا پیام
نئی سحر کے اجالے نئی صبا کا سلام
بچھی ہوئی ہے فضا میں ردائے نکہت و نور
سجے ہوئے ہیں بہر سمت فصل گل کے خیام

یہ آرزو تھی کہ تجھ کو دلہا بنا دیکھوں
رخِ حسیں پہ حسیں دور کی ضیا دیکھوں
نہ جانے کب سے یہ ارماں چھپائے بیٹھی تھی
کہ اپنے چاند پہ سہرا سجا ہوا دیکھوں

خدا نے آج دکھایا یہ مجھ کو روز سعید
کلی کلی کی زباں پر ہے صبحِ نو کی نوید
خوشا کہ طاہرہؔ لائی ہے آج اس گھر میں
مسرتوں کے خزانے، سعادتوں کی کلید

بسا کے آج دلوں میں مسرتوں کے نگر
رشیدؔ و قاسمؔ و رضیہؔ، صفیّہؔ و سرورؔ
خلوص و مہر کا سہرا سجانے آئے ہیں
نعیمؔ ہوں کہ عطیّہؔ، فہیمؔ ہوں کہ قمرؔ

زہے نصیب کہ آئی وہ چاند سی دلہن
کہ جس کے نور سے جگمگ ہے آج صحنِ چمن
وہ دن کہ جسکی تمنا میں سال بیتے ہیں
بشکلِ طاہرہؔ پھوٹی ہے اس کی پہلی کرن

امین تم کو مبارک حیاتِ نو کی بہار
تمہارے گلشنِ ہستی پہ رحمتوں کی پھوار
یہ زندگی کے سفر کی حسیں تریں منزل
یہ عشرتوں کا سویرا، مسرتوں کا نکھار

دلہن جو آئی ہے آنکھوں کا نور بن کے رہے
دلوں میں گھر کرے، گھر کا سرور بن کر رہے
تو اس کے واسطے فردوسِ زیست بن جائے
یہ تیرے واسطے دنیا میں حور بن کے رہے

پیامِ مسرت

اپنے بھتیجے خلیل اشرف عثمانی اور بھتیجی سمیرا کے باہم نکاح کے موقع پر

یہ کون الفت کے راستے پر چلا ہے دنیا نئی بسانے
یہ کس کے آگے الٹ دیئے ہیں بہار نے حسن کے خزانے

سعادتوں کی نوید لیکر وہ ملکۂ صبح مسکرائی
وہ آفتابِ امید نکلا ہے دل کی دنیا کو جگمگانے

سرور و مستی کی دیویوں نے وہ گیت چھیڑے ہیں سازِ دل پر
کہ ہر روش پر بکھر گئے ہیں پیار کے مدھ بھرے ترانے

خلیلؔ! تم کو سدا مبارک یہ چاہتوں کی نرالی راہیں
یہ مہر و الفت کے تازہ رشتے، محبتوں کے نئے ٹھکانے

تمہیں مبارک حیاتِ نو کے یہ کیف پرور حسین لمحے
یہ عشرتوں کے نئے جزیرے، یہ رنگ و نکہت کے آشیانے

تمہارے گلشن پہ رحمتوں کی حسین گھٹائیں جھکی ہوئی ہیں
مری سمیرا جو آرہی ہے شراب الفت کے خُم لنڈھانے

یہ میرا نورِ نظر ہے دولہا، وہ میری لختِ جگر ہے دلہن
یہ کیسی خوشیوں کا دن دکھایا ہے، آج کچھ رحمتِ خدا نے

دلہن کے ماتھے پہ جلوہ گر ہے وفا کا ٹیکہ، حیا کا جھومر
دُلہا کے سہرے میں بزم آرا ہیں حُسن کے سرمدی خزانے

عزیزہ سہرے کی ہر لڑی میں نظر کے موتی پرو رہی ہیں
رضی کے خوابوں کی ایسی تعبیر بھیج دی رحمتِ خدا نے

مرے دلہا اور دلہن کو یارب! ہمیشہ آباد و شاد رکھیو
رہیں سدا ان کے سر پہ تیری عظیم رحمت کے شامیانے

بڑی بہن کے سفرِ حجّ کے موقع پر

محرم ۱۳۸۲ھ مطابق جون ۱۹۶۲ء میں میری بڑی بہن (محترمہ عتیقہ خاتون صاحبہ مدظلہا) جنہیں ہم آپا بی کہتے ہیں، حج کے سفر سے واپس آئیں تو میں نے یہ اشعار کہے:

مبارک تم کو آپا بی! بڑی دولت ملی تم کو
جو ہر نعمت سے بڑھ کر ہے وہی نعمت ملی تم کو

مبارک ہو دیارِ مصطفیٰؐ کو دیکھ کر آنا
خدا کی رحمتوں سے دامن امید بھر لانا

تمہارے یہ قدم بیتِ خدا کے گرد گھومے ہیں
انہوں نے وادیٔ فاراں کے ذرّے بھی چومے ہیں

مجھے تو رشک آتا ہے تمہاری ان نگاہوں پر
جو سجدے کر کے آئی ہیں نبیؐ کی سجدہ گاہوں پر

الٰہی اپنے آسیؔ پر تُو یہ احسان فرما دے
کہ اُسکو اک دفعہ پھر وادیٔ بطحا میں پہنچا دے

دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد

سلام اے میرے گلشن، علم وفن کے پاک گہوارے
ہدایت کے فلک پر علم کے تابندہ سیارے

تری آغوش شفقت سے نکل کر جارہاہوں میں
مرے قلب وجگر بے چین ہیں، گھبرا رہا ہوں میں

چلا جاؤنگا میں ان علم کی دلکش فضاؤں سے
تری ان روح پرور اور کیف افزا ہواؤں سے

جہاں پر عمر کے میں نے سہانے دن گذارے ہیں
جہاں کے پھول تو ہیں پھول، مجھ کو خار پیارے ہیں

جہاں کا ذرّہ ذرّہ واقفِ اسرارِ الفت ہے
جہاں کا ایک اک گوشہ مرے خوابوں کی جنت ہے

جہاں آ کر میں آسی اپنی ہستی بھول جاتا تھا
خدا کی نعمتوں میں خود پرستی بھول جاتا تھا

مگر اے میرے گلشن! تو نہ ہو اندوہ گیں اتنا
ہماری اس جدائی پر ملول اتنا، حزیں اتنا

سبق تو نے پڑھایا ہے ہمیں عزم اور ہمت کا
"صداقت کا، شجاعت کا، امانت کا، عدالت کا"

نہ بھٹکیں جس سے ہم تو نے ہمیں وہ رہ دکھائی ہے
تری تعلیم ہی تو ہم پہ بن کر نور چھائی ہے

خدا توفیق دے، اُس سے ہمیں زائل نہ دیکھے گا
اور اپنی کوششوں کو ہم پہ لاحاصل نہ دیکھے گا

امنگیں ہیں ہمارے دل میں اب کچھ کام کرنے کی
ترے پیغام کو مشہور کرنے، عام کرنے کی

چمن پر باغباں کے بھیس میں صیاد بیٹھے ہیں
نہیں ہے کوہکن کوئی، مگر فرہاد بیٹھے ہیں

بسے، پھولے پھلے تُو، اور جہاں میں جگمگائے تُو
بہاروں کے حسیں جھرمٹ میں رہ کر مسکرائے تُو

۱۹۵۹ء

پی لو!

دورۂ حدیث کے سال نہ جانے کس دھن میں اپنے درس کے ساتھیوں
سے خطاب کرتے ہوئے میں نے کچھ شعر بھی کہہ دیئے تھے

بہت ہی سخت آگے گردشِ ایام ہے، پی لو!
غنیمت ہے کہ گردش میں ابھی تک جام ہے، پی لو!

تمہیں تصویرِ ہستی میں وفا کا رنگ بھرنا ہے
جفا و جور کی ظلمت جہاں میں عام ہے، پی لو!

تمہیں طاغوت کی بے رحم طغیانی سے لڑنا ہے
بہت سا کام ہے، پی لو، بہت سا کام ہے، پی لو!

سخاوت جام و مینا کی بڑی نعمت ہے دیوانو!
یہ ساقی کی توجہ بھی بڑا انعام ہے، پی لو!

۱۹۵۹ء

بچپن کے شعر

بارہ سال کی عمر سے اٹھارہ سال کی عمر تک کہے ہوئے شعر

بندہ کی تک بندیاں بچپن ہی میں شروع ہو گئی تھیں، میرے استاذ حضرت مولانا سبحان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو خود بھی قادر البیان شاعر تھے، ہمیں کوئی مصرع دے کر اس کی زمین میں شعر کہنے کی دعوت دیا کرتے تھے، اس زمانے کی کچھ غزلیں اور نظمیں مجھے اپنی ایک پرانی کاپی میں مل گئیں۔

اس نام نہاد شاعری کی ناپختگی کے باوجود دل نہ چاہا کہ اُسے اس مجموعے میں شامل نہ کیا جائے، اس لئے بچپن کی یادگار کے طور پر اسے بھی شامل کر رہا ہوں۔

غزل

طرح: انہیں میری الفت کی کیسے خبر ہو

مری خستگی پر کرم کی نظر ہو
خدارا مداوائے زخمِ جگر ہو

یہ کہتی ہے دنیا، ہو موجود ہر جا
نہ معلوم پھر بھی کہاں ہو؟ کدھر ہو؟

ہو جانِ دو عالم اک ایسی تجلّی
کہ خورشید شرمائے، حیراں قمر ہو

تجلّی کا تیری پڑا عکسِ تاباں
یہ شک رات پر تھا کہ شاید سحر ہو

بکھر جائیں گیسو جو شانوں پہ انکے
تو دنیا کی تنظیم زیر و زبر ہو

دعا تجھ سے آسیؔ کی یہ ہے الٰہی
کہ رحمت کا تیری یہی مستقر ہو

(۱۹۵۵ء)

غزل

کار فرما زمانے میں غم ہے
غم ہی تقویمِ ابنِ آدم ہے

یہ جو نرگس پہ قطرہ لرزاں ہے
قلبِ مضطر ہے یا کہ شبنم ہے

اپنے ہاتھوں سے دی ہے ساقی نے
مَے نہیں شیخ! آبِ زم زم ہے

چشمِ ساقی اگر نہیں مائل
پھر تو جنت بھی اک جہنم ہے

کیا انہیں ہو چلا ہے میرا خیال
درد کیوں دل میں آج کم کم ہے

بجھ رہا ہے چراغِ درد و الم
زندگی کی اُمید مدّھم ہے

جب سے آسیؔ نے پی ہے آنکھوں سے
کچھ عجب بیخودی کا عالم ہے

(۱۹۵۶ء)

تہنیت

بتقریب جشنِ یوم جمہوریہ پاکستان ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء

بہار آئی ہے گلشن میں سرورِ جانفزا بنکر
گلوں کی نکہتیں لیکر دلوں کا مدّعا بنکر

مبارک ہو مسلمانو! تمہیں آئینِ پاکستاں
ہزاروں آندھیاں آئیں مگر پھر بھی رہا، بنکر

بہر جانب تھی تاریکی، بہر سو دل تھے پژمردہ
یہ آئیں ہے جو چمکا ہے یہاں بدر الدجیٰ بنکر

رہی اسکی حکومت ظاہر و باطن پہ برسوں تک
یہی آئیں رہا دنیا میں آئینِ وفا بنکر

اسی نے ڈوبتی دنیا کو پہنچایا لب ساحل
یہی تو آیا تھا انسانیت کا ناخدا بنکر

دعائیں یہ نکلتی ہیں لب مسلم سے اے آسیؔ
کہ یہ آئیں رہے دنیا میں سب کا پیشوا بنکر

(۱۹۵۶ء)

غزل

آنسو نکل پڑے ہیں بہاروں کو دیکھ کر
راتیں گذار دی ہیں ستاروں کو دیکھ کر

طوفاں پرست ہوں، مجھے ساحل نہیں عزیز
کشتی ڈبو رہا ہوں کناروں کو دیکھ کر

دیوانگی کی خیر خدایا یہ کیا ہوا؟
کیوں ہوش آرہا ہے سہاروں کو دیکھ کر

اس خوف سے کہ مجھ کو دوبارہ نہ لوٹ لیں
نظریں چُرا گیا ہوں میں یاروں کو دیکھ کر

اپنے ہی دل کی دیکھنا آسیؔ نزاکتیں
اکثر اُمڈ پڑا ہے پھواروں کو دیکھ کر

(۲۵ مئی ۱۹۵۸ء)

واردات

ایک نامکمل نظم جو مسلمانوں کے زوال کا مرثیہ
کہنے کی غرض سے شروع کی گئی، مگر مکمل نہ ہو سکی۔

نہ جانے کیوں کئی دن سے میں کچھ مغموم رہتا ہوں
بہت ہی سخت ہے وہ درد جسکو دل پہ سہتا ہوں

حیات اک اضطراب جاوداں معلوم ہوتی ہے
فضا کتنی ہی دلکش ہو، دھواں معلوم ہوتی ہے

محیطِ دل میں طوفانِ غم و آلام کے دھارے
تنفس کی ہے یہ رفتار یا چلتے ہوئے آرے

مرا سینہ غم و اندوہ کی نالوں کی بستی ہے
کہ تنہائی کی ناگن مجھ کو بے دردی سے ڈستی ہے

یہ شبنم رازدارِ دل تھی اب گھنٹوں رُلاتی ہے
صبا بھی اب غم و آلام کے پیغام لاتی ہے

یہ وہ دل ہے کبھی جو نازشِ باغ و بہاراں تھا
ہر اک لمحہ مرے دل کیلئے خوشیوں کا ساماں تھا

کبھی یہ ماہ و انجم بھی اسی پر رشک کرتے تھے
غم و آلام اس کے پاس آنے سے بھی ڈرتے تھے

بہت سرشار تھا میں بھی کبھی فرطِ مسرت سے
مرا دل گونجتا تھا نغمہ ہائے عیش و عشرت سے

خوشا وہ دن کہ میں ہر وقت شاداں اور خنداں تھا
دماغ و دل کی محفل میں چراغاں ہی چراغاں تھا

شراب عیش کے نشے میں بس مدہوش رہتا تھا
مسرت بیکراں دریا تھی اور میں اس میں بہتا تھا

ستاروں کی خنک چھاؤں سرور انگیز تھی پہلے
نسیم صُبح کی ورزش ترنّم ریز تھی پہلے

بہت پُرکیف تھیں ہمدم کبھی یہ بھیگی برساتیں
مسرت کے حسیں دن تھے، محبت کی جواں راتیں

یکا یک کیا ہوا مجھ سے یہ جنّت چھن گئی یارب!
مرے دل کی مقدر سے مسرت چھن گئی یارب!

۳ مئی ۱۹۶۱ء

گلہائے تہنیت

اپنی بھابی (اہلیہ جناب محمد رضی عثمانی صاحب مرحوم) کی فرمائش پہ ان
کے بھائی جناب محمد زکریا صاحب مرحوم کی شادی کی تقریب میں یہ
گلہائے تہنیت بھابی کی طرف سے پیش ہوئے۔

مبارک ہو تمہیں بھائی تمہیں شادی مبارک ہو
امنگوں آرزوؤں کی نئی وادی مبارک ہو

مبارک ہو گل و لالہ کی قسمت آج جاگ اٹھی
خزاں رُسوا ہوئی ایسی کہ اُلٹے پاؤں بھاگ اٹھی

زہے قسمت کہ بھائی آج دولہا بنکے آئے ہیں
تمناؤں کی کلیاں کھل اٹھیں گل مسکرائے ہیں

بہت مسرور سب پیر و جواں معلوم ہوتے ہیں
مجھے تو بام و در بھی نغمہ خواں معلوم ہوتے ہیں

کسی کے لب پہ نغمے ہیں کہیں پیہم دعائیں ہیں
مبارک ہو مبارک ہو، کی ہر جانب صدائیں ہیں

مسرت دیدنی ہے والدِ ماجد کے چہرے پر
جمالِ یوسفؔ کا آج کچھ پرتو ہے سہرے پر

بہت مسرور ہیں الیاسؔ بھائی اور نازاں ہیں
میاں بُرھانؔ اپنے بھائی کی شادی پہ شاداں ہیں

خدیجہؔ عیش و عشرت کے ترانے گنگناتی ہے
ہر اک محفل میں سہرے خود ہی پڑھ پڑھ کر سناتی ہے

جمیلہؔ کی برابر شادماں شاید نہیں کوئی
مسرت کی خبر سُن کر وہ راتوں سے نہیں سوئی

خبر شادی کی عارفؔ نے جو اسماؔ کو سنادی ہے
وہ گاتی پھرتی ہے ہر سُو مرے ماموں کی شادی ہے

مبارک والدہ کے خواب کی تعبیر بن جانا
مبارک ہو تمہیں شادی مبارک بھابی فرغانہؔ

عزیزہؔ بھی دعا گو ہے رہیں شیر و شکر دونوں
یہ راہِ زندگانی کے رفیق و ہم سفر دونوں

الٰہی یہ مسرّت عیش کی تمہید بن جائے
ہر اک لمحہ خوشی میں گذرے ہر دن عید بن جائے

مُقطّعات

اور

مُتفرّق اشعار

میدانِ عرفات میں (۱۹۶۴ء)

لبّیک یارَبِّ مِن عَبدٍ حَوَاہُ ھَوَیٰ
مِنّی الذّنوبُ وَ مِنک الجود والکرمُ

سَقیاً بِفَضلِکَ إذ دُنیایَ مجدِبۃٌ
و عِندَ شدّۃِ محلٍ تُرتجی الدِّیَمُ

تابِ دید تو نہ دار نگہِ شوقِ کسے
شمعِ امید بچہ گونہ دریں شب بفروزد

زُلف شب زادۂ تو می گزدم صورتِ مار
روئے زیبائے تو چوں شمس مرامی سوزد

سلہٹ سے روانہ ہوتے وقت

بہ وفورِ جذبۂ غم آسیؔ سلام گوید
بزمیں کہ نفسِ خود را بہ سپرد اولیا را

سلہٹ ۹ فروری ۱۹۶۱ء

وہ عارض حسیں ہے نہ وہ زلفِ مُشک ریز
بے صبح و شام کیسا زمانہ ہے ان دنوں

افسردہ ہے جو دل تو طبیعت اُداس اُداس
ہنسنا ہے آجکل نہ ہنسانا ہے ان دنوں

سکون ہو جو دلوں میں تو بات ہے ورنہ
ہزار بار بہاریں بھی مسکرائی ہیں

بھلا ہمیں کسی رہبر کی جستجو کیوں ہو
جنونِ شوق نے راہیں ہمیں دکھائی ہیں

کچھ دن کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنی پڑی، زمین پر سجدہ نہ کرسکا، اس وقت کے دو شعر:

بندگی عشق بھی ہے، سوز بھی ہے، ناز بھی ہے
راز کی بات ہے چُھپکے ہی سے پہنچانے دے

طالبِ قُرب ہوں، لیکن مری کُرسی ہے حجاب
خاک کے راستے اب عرش تک آجانے دے

غمِ دوراں سے نبھانا تو ہے آساں لیکن
بات جب ہے غمِ جاناں سے نباہے کوئی

نہ شہرتوں کے تصادم میں لے چلو مجھ کو
کہ راس ہے مرے دل کو یہ کُنجِ تنہائی

پھر عشق و محبت بھی دو قسم کا ہے، ایک وہ جسے عشق مجازی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور دوسرا وہ جسے عشق حقیقی کہتے ہیں، پہلے کا تعلق مخلوق سے ہے اور دوسرے کا خالق سے، پہلے میں بظاہر جوش و خروش زیادہ ہوتا ہے، لیکن پائیداری کم ہے، اور دوسرے میں عموماً ٹھہراؤ ہوتا ہے، لیکن پائیداری بہت، پہلا اکثر مرور ایام سے دھیما پڑ جاتا ہے اور دوسرے میں مرورِ ایام سے پختگی آتی جاتی ہے، پہلے کا منتہائے مقصود وصال ہے اور دوسرے کا مقصود رضائے دوست، پہلے کا تعلق صفات سے ہے، اور دوسرے کا تعلق ذات سے، اس لئے پہلی قسم کا عشق اکثر ہوس کی سرحدوں کو چھونے لگتا ہے، اور دوسری قسم ہوس سے کوسوں دور ہے۔ اور چونکہ عشق درحقیقت وہی ہے جو ذات سے ہو، جس کا مقصود رضائے دوست، اور جو مرورِ ایام سے دھیما نہ پڑے، اس لئے دوسری قسم کا عشق ہی حقیقی عشق ہے، اور پہلی قسم کو محض مجازاً عشق سے تعبیر کر دیا جاتا ہے، ورنہ درحقیقت وہ عشق ہے ہی نہیں۔

وہ عشق جس کی آگ بجھا دے اجل کی پھونک
اس میں مزا نہیں تپش انتظار کا

(محمد تقی عثمانی: نعتِ رسول)

عشق حقیقت میں وہی ہے، جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے ہو، اور عشق رسول (ﷺ) سے بھی در حقیقت مخلوق ہونے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اس حیثیت سے ہوتا ہے کہ آپ ﷺ خالق تک پہنچنے کا لازمی واسطہ ہیں، آپؐ کے بغیر کوئی شخص خالق تک نہیں پہنچ سکتا، اس لئے عشق خداوندی اور عشق رسول دونوں لازم وملزوم ہیں، انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں خود ارشاد فرمادیا کہ اگر مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے رسول کی اتباع کرو، اس لئے عشقِ خداوندی اتباعِ رسولؐ کی شکل میں عشقِ رسولؐ کے بغیر ناممکن ہے۔

خلاصہ یہ کہ شعر کا موضوع محبت ہے، اور محبت کا اصل موضوع حضور سرورِ دوعالم ﷺ کی ذات گرامی۔ اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے تو شاید زیادتی نہ ہو کہ شعر کا اصل موضوع ہی آنحضرت ﷺ کی ذاتِ اقدس ہونی چاہئے اور شعر در حقیقت وہی شعر ہے جو اللہ یا اس کے رسول ﷺ کی محبت میں کہا گیا ہو، یہ اور بات ہے کہ کبھی محبت کا موضوع صاف لفظوں میں ظاہر کر دیا جائے اور اس کا نام ''نعت'' رکھ دیا جائے، اور کبھی اسے استعارے کا لباس پہنا کر اسے ''غزل'' سے تعبیر کر دیا جائے۔ اور چونکہ بلاغت کا یہ قاعدہ صدیوں سے مسلم چلا آتا ہے کہ ''الكناية أبلغ من الصريح'' (یعنی کنایہ تصریح سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے) اس لئے بڑے بڑے متدین شعراء نے بھی عشقِ حقیقی کے اظہار کے لئے ''حمد ونعت'' کے بجائے ''غزل'' کا پیرایہ کثرت سے استعمال کیا، یہاں تک کہ غالب نے کہہ ہی دیا ہے کہ ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

چنانچہ ہماری شاعری کی اصل روایت یہی ہے کہ اس کا موضوع اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت ہے، اور خواہ پیرایہ اظہارِ غزل کا استعمال ہوا ہو، لیکن معانی میں اکثر و بیشتر اس اصل موضوع کا لحاظ رکھا گیا ہے، یہاں تک کہ وہ شعراء جو عملی زندگی میں بہت سی کوتاہیوں میں مبتلا رہے، وہ بھی اپنی شاعری کو اس اصل موضوع سے کلی طور پر جدا نہ کر سکے، اور غالب یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ؎

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہماری صفِ اول کی شاعری کا اصل محور ''حمد ونعت'' ہی ہے، جسے استعارے اور کنائے کا پیرایہ استعمال کرتے ہوئے بسا اوقات ''غزل'' کا رنگ دے دیا گیا ہے۔

لیکن جہاں شاعر نے استعارے اور کنائے کے بغیر صراحت کا استعمال کرتے ہوئے حضور سرورِ دوعالم ﷺ کو اپنے شعر کا موضوع بنایا، وہاں ان اشعار کو ''نعت'' کا نام دیا گیا، اور وہ ایک مستقل صنف سخن بن گئی۔

(محمد تقی عثمانی: نعت رسولؐ)

گوشۂ تنہائی ، شعری مجموعہ

محمد تقی مشتاق